اقبال اکادمی

عِلمُ الاِقتصاد

شیخ محمد اقبال

علم الاقتصاد

[جسکا معروف نام علم سیاست مدن ہے]

مصنفہ
شیخ محمد اقبال - ایم - اے - اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج - لاہور

اقبال اکادمی - کراچی

فہرست

باب	مضمون	صفحہ
	پیش لفظ از ممتاز حسن	۱
	مقدمہ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی	۱۱
	پیشکش	۲۱
	دیباچۂ مصنف	۲۳
	حصہ اول : علم الاقتصاد	
باب اول	علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق	۱
	حصہ دوئم : پیدائش دولت	
باب اول	زمین	۲۷
باب دوئم	محنت	۳۵
باب سوئم	سرمایہ	۴۷
باب چہارم	کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے	۵۲

باب	مضمون	صفحہ
	حصہ سوئم : تبادلہٴ دولت	
باب اول	مسئلہ قدر	۶۹
باب دوئم	تجارت بین الاقوام	۹۰
باب سوئم	زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر	۱۰۵
باب چہارم	حق الضرب	۱۲۱
باب پنجم	زر کاغذی	۱۳۱
باب ششم	اعتبار اور اس کی ماہیت	۱۳۹
	حصہٴ چہارم : پیداوار دولت کے حصہ دار	
باب اول	لگان	۱۴۷
باب دوئم	سود	۱۵۴
باب سوئم	منافع	۱۵۹
باب چہارم	اجرت	۱۶۸
باب پنجم	مقابلہٴ نامکمل کا اثر دستکاروں کی حالت پر	۱۷۹
باب ششم	مالگذاری	۱۸۶

باب	مضمون	صفحہ
	حصہ پنجم	
باب اول	آبادی وجہ معیشت	۱۹۵
باب دوئم	جدید ضروریات کا پیدا ہونا	۲۰۴
باب سوئم	صرف دولت	۲۰۹
	ضمیمہ	
	اصطلاحات	۲۱۲

پیش لفظ

اقبال کی " علم الاقتصاد " ۱۹۰۳ع میں شائع ہوئی تھی - اس کے بعد اس کی دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آئی - اور اشاعت تو در کنار یہ کتاب نظروں سے ایسی غائب ہوئی کہ کہیں سے ایک نسخہ مہیا کرنا بھی دشوار ہوگیا - اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ خود اقبال نے اپنی اس تصنیف کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی - میری ایک عرصے سے یہ تمنا تھی کہ علمی دنیا کو اقبال کی اس قدیم اور گراں مایہ تصنیف سے دوبارہ روشناس کرایا جائے - خوش قسمتی سے لاہور کی پبلک لائبریری میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا - اسے عاریتاً اقبال اکیڈمی کے لئے حاصل کیا گیا - اور کراچی میں اس نسخے کی ایک عکسی نقل تیار کی گئی - موجودہ نسخہ اسی عکس پر مبنی ہے -

" علم الاقتصاد " اردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب ہے - اس کے بہت بعد پروفیسر الیاس برنی ، پروفیسر حبیب الرحمن اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی مختلف کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں - اور ان کے علاوہ اگرچہ دوسرے مصنفین نے بھی، خصوصاً حیدرآباد میں، وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں اور مقالے لکھے، مگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معاشیات پر اردو میں کتابوں کی کثرت نہیں ہے - جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے علم کے اس شعبے سے کسی زمانے میں بھی کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا - گزشتہ دور میں غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی ہی ایک ایسے مفکر ہیں جنہوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور ان کے عروج و زوال کے مطالعے کے سلسلے میں معاشی اور اقتصادی عناصر و عوامل کا جائزہ لیا یا سید احمد خاں ہیں جنہوں نے " اسباب بغاوت ہند " میں سنہ ۱۸۵۷ع کی کشمکش کے معاشی پہلوؤں پر تبصرہ کیا - بیسویں صدی کے آغاز میں اردو کے مشہور انشاء پرداز مہدی حسن نے اپنے آپ کو

مہدی افادی الاقتصادی لکھا' مگر اقتصادیات کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کوشش منظر عام پر نہیں آئی - اسلامی معاشیات کے موضوع پر بھی مناظر احسن گیلانی ، حفظ الرحمن سیوہاروی ، ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور ڈاکٹر یوسف الدین کی تصنیفات کے علاوہ اردو میں کم ہی لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی '' علم الاقتصاد ،، اردو میں اپنی اولیت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

'' علم الاقتصاد ،، کی یہ دوسری اشاعت اٹھاون سال بعد اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام عمل میں آ رہی ہے۔ یہ اکیڈمی کی سعادت اور خوش بختی ہے کہ اسے اس اہم تصنیف کو جو زمانے کی فراموش گاری کا شکار ہو چکی تھی ، دوبارہ زندہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب کا اصل خطی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا - موجودہ اشاعت میں ۱۹۰۳ء کی اشاعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس اشاعت میں کتابت کی متعدد غلطیاں تھیں جن کی موجودہ اشاعت کے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے- البتہ ایسے مقامات پر حاشیے میں سنہ ۱۹۰۳ء کے متن کے الفاظ نقل کر دئے گئے ہیں -

ہم جناب ڈاکٹر انور اقبال قریشی کے ممنون ہیں جنہوں نے اکیڈمی کی درخواست پر اس کتاب کے لئے ایک عالمانہ دیباچہ تحریر فرمایا - ڈاکٹر صاحب کے دیباچے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال کی یہ تصنیف نہ صرف اپنے زمانے کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھی بلکہ آج بھی اس کی افادیت ایک بڑی حد تک برقرار ہے۔ جہاں تک کتاب کے علمی مباحث کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے ان پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ میں محض کتاب کے لسانی پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں - اقبال کی اس تصنیف نے سب سے پہلے اردو زبان میں جدید معاشیات سے متعلق الفاظ فراہم کئے - جیسا کہ خود اقبال نے وضاحت کی ہے یہ کتاب اشاعت سے پہلے شبلی کی نظر سے گزری تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو شبلی کی سند حاصل ہے۔ البتہ موجودہ دور میں جو نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کئے گئے ہیں ان کی فہرست موجودہ اشاعت میں علیحدہ طور پر کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

"علم الاقتصاد"، میں مصنف کی جدت فکر اور موضوع پر گرفت کے پیش نظر ڈاکٹر قریشی کی رائے ہے کہ اقبال کو معاشیات کی طرف مستقل توجہ دینی چاہئے تھی - یہ ایک ماہر اقتصادیات کی رائے ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر، مگر واقع یہ ہے کہ اقتصادیات کا مطالعہ اقبال کی زندگی میں ایک ضمنی حیثیت رکھتا تھا اور اس سے زیادہ غالباً ممکن بھی نہ تھا - اگرچہ اقبال کو زندگی بھر معاشیات سے دلچسپی رہی لیکن انہیں اس موضوع سے وہ تعلق پیدا نہ ہوا جو شعر، فلسفہ، سیاسیات اور قانون دانی سے تھا - خود اقبال نے مجھ سے بیان کیا کہ کیمرج کے زمانے میں انہیں وقتاً فوقتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ فلسفے میں ان کا انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے - چنانچہ اس احساس کے پیش نظر وہ کیمرج کی دانش گاہ میں گاہے گاہے اقتصادیات کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے تاکہ اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھ سکیں -

نفس مضمون کے اعتبار سے مجھے اس کتاب کے دو موضوعات کا تذکرہ کرنا ہے - اول یہ کہ اقبال نے قومی تعلیم کو معاشی ترقی اور ملکی پیداوار کی افزائش کا لازمی وسیلہ قرار دیا ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جو اکثر ماہرین اقتصادیات کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے - ذاتی طور پر مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم و ملزوم ہیں اور جب تک کسی ملک میں قومی تعلیم پورے طور پر عام نہ ہو وہ ملک کما حقہ اقتصادی ترقی نہیں کر سکتا -

دوسرا مسئلہ جس پر اقبال نے جدت فکر کا ثبوت دیا ہے آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہے - یہ مسئلہ ہند و پاکستان کے برصغیر میں ایک مدت تک کم و بیش ذہنی غفلت کا شکار رہا - حتٰی کہ ماہرین اقتصادیات نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی - سب سے پہلی کتاب جو اس موضوع پر لکھی گئی پی - کے واتل کی مشہور تصنیف "ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ" تھی - یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی - واتل بھی اقبال کی طرح تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی کے حامی ہیں - اس دبستان خیال کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے مگر اس حقیقت کا اعتراف

لازم ہے کہ اس برصغیر میں اس کی قیادت کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ اور اولیت انہیں کو حاصل ہے ۔ ان کے الفاظ غور سے پڑھنے کے قابل ہیں :—

''ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے۔ مگر ہم کو بھی چاہئے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں . . . . اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال آج سے ساٹھ سال پہلے ہمارے موجودہ معاشی مسائل کو ہم سے زیادہ اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔

اس سلسلہ میں اقبال کی وہ تحریر بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو رسالہ ''الحکیم،، لاہور کے نومبر سنہ۱۹۳۶ء کے شمارے میں چھپی اور جسے ''رسالہ ہمدرد صحت،، دہلی نے جولائی سنہ۱۹۳۹ء میں اپنے ''ضبط تولید'' نمبر میں نقل کیا ہے ۔ اس تحریر میں اقبال نے آبادی کی افزائش اور ضبط تولید کے مسئلے پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ آپ لکھتے ہیں :—

''شریعت اسلامی نے اجتماعی مسائل میں مصالح امت کو نظر انداز نہیں کیا اور اسکے تصفیے کو اہل علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات و مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کریں ۔ اس لئے اگر حظ نفس مقصود نہ ہو ، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضا مند ہوں تو جہاں تک میرا علم رہنمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں ہے۔ اصول شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو ، اگر وہ اولاد کی خواہشمند نہ ہو ، اولاد پیدا کرنے پر باکراہ مجبور نہیں کر سکتا ۔ لیکن دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ حظ نفس پر مبنی ہے اور محض حظ نفس کے لئے ایسا کرنا

میرے نزدیک حرمت کے درجے تک پہنچتا ہے ..... شرعی پہلو سے جو میں نے رائے دی ہے وہ ماہر شریعت کی حیثیت سے نہیں دی محض اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دی ہے۔"

معاشیات کے مسائل اقبال کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی نہ بن سکے ۔ مگر انہیں اس موضوع سے عمر بھر ایک گہری دلچسپی رہی ۔ اس کی جھلک ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں پائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے علیگڑھ میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے جو لیکچر دیا اس میں فرمایا ۔

"سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہے' یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے ۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کردی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں ۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات' عادات' اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا ۔ اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے؟ شرح مال گزاری میں آئے دن کا اضافہ' مسکرات ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد' قیمت اجناس کی گرانی کا باعث ممکن ہے یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا' یا کوئی اور سبب ہو ۔"

دسمبر ۱۹۳۰ء والے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں جہاں انہوں نے پاکستان کا تصور پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش کیا' انہوں نے ایک

سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کی اقتصادی بد حالی اور مقروضیت کا تذکرہ کیا ۔ اسی طرح مارچ ۱۹۳۲ء والے لاہور کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان نوجوانوں کی انجمنیں اس غرض کے لئے قایم کی جائیں کہ وہ اور باتوں کے علاوہ تجارت اور کاروبار کے میدان میں تنظیم کے لئے جدوجہد کریں اور دیہات میں مسلمان کاشتکاروں کی اقتصادی بد حالی اور مقروضیت کے ازالے کے لئے ایک تبلیغی مہم چلائیں ۔

جس زمانے میں اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انہوں نے صوبائی میزانیہ پر وقتاً فوقتاً تقریریں کیں ۔ منجملہ اور تجویزوں کے ان کی ایک تجویز یہ تھی کہ جن کاشتکاروں کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہو انہیں انکم ٹیکس کی طرح لگان میں رعایت دی جائے۔ یا اس سے معافی دی جائے۔ اقبال کی اس تجویز پر پنجاب لیجسلیٹو کونسل نے توجہ نہیں فرمائی۔ مگر آج کل یہی مسئلہ ہمارے لئے اہمیت اختیار کر چکا ہے اور پاکستان کے اندر اور باہر اقبال کے ہم خیال موجود ہیں ۔

معاشی مسائل سے اقبال کی دلچسپی ان کی شاعری میں بھی جا بجا جھلکتی ہے ۔ ''خضر راہ'' میں شاعر جناب خضر سے سوال کرتا ہے

زندگی کا راز کیا ہے ؟ سلطنت کیا چیز ہے ؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش ؟

خضر کا جواب نظم کے ایک بند میں ہے۔ یہ جواب ''بندۂ مزدور'' کے نام ایک پیغام ہے :-

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
آٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

''بال جبریل'' میں لینن خدا کے حضور میں عرض گذار ہے :-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

''ضرب کلیم'' میں کارل مارکس کی زبان سے مغربی معاشیین کو مخاطب کیا گیا ہے :-

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز کجدار کی نمائش

''جاوید نامہ'' میں جمال الدین افغانی ملت روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے سود کے متعلق فرماتے ہیں :-

از ربا دانی چہ می زاید ؟ فتن
کس نداند لذت قرض حسن
از ربا جاں تیرہ دل چون خشت وسنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزق خود را از زمین بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

اس سے آگے بڑھئے تو خود خدا کا پیغام ہے فرشتوں کے نام :-

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دھقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

البتہ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں اقبال مزدور کے حامی ہیں اور لینن اور کارل مارکس کی زبان سے انہوں نے بہت کچھ کہا اور کہلوایا ہے، مگر وہ روسی اشتراکیت کو، جو مساوات شکم سے زیادہ نہیں، لا دینیت اور منفیت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں۔

روس را قلب و جگر گردید خوں
از ضمیرش حرف لا آمد بروں
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الہ
فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوئے الّا نراند
در مقام لا نیاساید حیات
سوے الا می خرامد کائنات

"ضرب کلیم" میں مغربی تہذیب کے دو اہم پہلوؤں پر ایک شعر میں کڑی تنقید کی ہے

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال　　مرد بیکار، زن تہی آغوش

مجھے اقبال کے معاشی نظریات سے بحث مطلوب نہیں ہے۔ وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ میرا مقصد فی الحال محض اس دلبستگی کو واضح کرنا تھا جو اقبال کو زندگی بھر معاشی مسائل سے رہی۔ ضرورت اس کی ہے کہ اقبال کے معاشی تصورات اور نظریات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لئے مناسب ہوگا کہ معاشی موضوعات پر اقبال کے اقوال یکجا کردئے جائیں اور ان پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے۔

اقبال کو اواخر عمر میں مسلمانوں کے افلاس اور اقتصادی زبوں حالی کا کس قدر شدید احساس تھا اس کا اندازہ کرنا ہو تو اس خط و کتابت کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو اقبال اور جناح کے مابین ہوئی۔ اقبال ' جناح کو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ع کے خط میں لکھتے ہیں۔

" روٹی کا مسئلہ دن بدن زیادہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ پچھلے دو سو سال سے ان کی معاشی حالت برابر گرتی جا رہی ہے۔ عام طور پر ان کا یہ خیال ہے کہ ان کا افلاس ہندو سود خواروں اور سرمایہ داروں کی بدولت ہے۔ ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان کے افلاس میں بیرونی استعمار کا بھی برابر کا دخل ہے مگر یہ احساس پیدا ہو کر رہے گا ....
سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس اور ناداری کے مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ مسلم لیگ کے مستقبل کا انحصار تمام تر اسی پر ہے کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل پیش کرتی ہے۔ "

" علم الاقتصاد " اور معاشیات پر اقبال کی مختلف تحریروں اور تقریروں کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے رہنماؤں میں قوم کی اقتصادی مشکلات کا جو احساس اور شعور اقبال کو تھا وہ کسی اور کو نہ تھا۔

موجودہ نسخے کے متن کی تصحیح مجلہ " اقبال ریویو " کے مدیر معاون جناب خورشید احمد صاحب کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے متن پر حواشی بھی لکھے ہیں اور کتابت کی غلطیوں کو بھی درست کر دیا ہے۔ لیکن ان پر کوئی نوٹ نہیں دیا۔ عام اغلاط کو درست کر دیا گیا ہے۔ اور حاشیہ میں نوٹ دے دیا ہے۔ انگریزی اصطلاحات حاشیے میں دی گئی ہیں۔ جہاں کسی لفظ یا اصطلاح کی توضیح ضروری تھی وہاں حاشیے میں تشریح کر دی گئی ہے۔

جہاں اصل نسخے میں اقبال کے لکھے ہوئے حواشی موجود ہیں، انہیں برقرار رکھا گیا ہے اور اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے۔ خورشید صاحب نے موجودہ متن کا موازنہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص کے نسخے سے بھی کیا ہے۔ اور جہاں جہاں فوٹو کے الفاظ صاف نہ تھے ان کو درست کر دیا ہے۔ انہوں نے اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی تیار کی ہے جو کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل ہے۔

کراچی ۱۰ جون ۱۹۶۱ء

ممتاز حسن

مقدمہ

یہ امر میرے لئے انتہائی باعث مسرت اور موجب افتخار ہے کہ میں اقبال اکیڈمی کراچی کے توسط سے ایک متاع گم گشتہ کی بازیافت میں مدد دے رہا ہوں ۔ اقبال کی زیر نظر تصنیف دنیا کے ادبی شاہکاروں کی طرح شراب کہن کی مانند ہے جس کی ارزش اور پرمائگی میں وقت کے گزرنے کے ساتھ کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا ہے ۔ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف علمی اور تخلیقی میدانوں میں دنیا ان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کو خراج عقیدت پیش کر چکی ہے ۔ لیکن موجودہ دور میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال کی پہلی تصنیف کا تعلق نہ شاعری سے ہے نہ فلسفے سے ۔ بلکہ ان کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر سنہ ۱۹۰۳ء میں علم الاقتصاد کے نام سے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں لاہور سے شائع ہوا ۔ جس میں معاشیات کے اہم مسائل کو نہایت واضح اور موثر طریق سے سلجھایا گیا ہے ۔ اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے چند حقائق بطور پس منظر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ کیوں کہ ان حقائق کی روشنی میں اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے سمجھنے میں ضروری مدد ملتی ہے ۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیکر بی ۔ اے کی سند حاصل کی تھی ۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں انہوں نے ایم ۔ اے کی ڈگری فلسفہ کے مضمون میں حاصل کی ۔ اور اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج میں اسی مضمون کے لیکچرار مقرر ہوئے ۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے ۔

"علم الاقتصاد"، یورپ جانے سے دو برس پیشتر اور ایم - اے فلسفہ کے چار سال بعد شائع ہوئی - کتاب پر جیسا کہ ہندوستانی اور پاکستانی کتابوں میں اکثر ہوتا ہے، اس کی تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اقبال نے اپنی کیمبرج کی تعلیم کے دوران میں معاشیات پر پروفیسر مارشل کے لکچر ضرور سنے ہوں گے، کیوں کہ اس زمانہ میں مارشل کا کیمبرج میں بہت شہرہ تھا اور یہ کتاب ان لیکچروں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہو گی - کتاب کو زیادہ غور سے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پروفیسر ٹاوسگ کا اثر زیادہ نمایاں ہے - آج سے بیس پچیس برس پیشتر ٹاوسگ کی کتاب بہت رائج تھی کیوں کہ مارشل کے مقابلے میں یہ زیادہ آسان ہے - لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ٹاوسگ کی کتاب دو جلدوں میں پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۰۹ع میں شائع ہوئی -

میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ "علم الاقتصاد"، سنہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی - اور اقبال سنہ ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے - اس وقت تک ٹاوسگ کی کتاب تو شائع ہی نہیں ہوئی تھی اور مارشل کے لکچروں سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا - اس پر طرہ یہ کہ اقبال نے معاشیات کی کوئی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی - اگر اس وقت انہوں نے کالج میں اس مضمون میں تعلیم حاصل کی بھی ہوتی تو اس سے چنداں فائدہ پہنچنے کی صورت نہ تھی، کیوں کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل نہ تو اس مضمون پر زیادہ کتابیں تھیں اور نہ ہی اس کا معیار تعلیم، کم سے کم پنجاب کے کالجوں کی حد تک، چنداں تسلی بخش تھا - یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۳ء میں اردو میں تو کیا انگریزی میں بھی معاشیات پر کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری - جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اردو میں معاشیات پر پہلی تصنیف الیاس برنی مرحوم کی کتاب علم المعشیت ہے جسے سنہ ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا - اسی زمانے میں حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا - اردو میں علمی اصطلاحات وضع ہونے لگیں - اور جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اردو میں معاشیات پر بھی

مطبوعات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ ان حالات میں کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ اصطلاحات اور نفس مضمون ''علم الاقتصاد'' ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

میرے ایک محترم دوست نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آپ کی رائے میں یہ کتاب موجودہ دور میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ مقابلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ۱۹۳۰ء کے ڈکوٹا ہوائی جہاز کا سنہ ۱۹۶۰ء کے بوئنگ جہاز سے کیا جائے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں بوئنگ جہاز کا تصور بھی موجود نہ تھا اور اس وقت عام رائج الوقت سواریوں کے مقابلے میں لوگ ڈکوٹا سے زیادہ مرعوب تھے۔ اور یہ اس وقت اتنا ہی زیادہ تیز رفتار تھا جتنا سنہ ۱۹۶۰ء میں مسدود سواریوں کے مقابلے میں بوئنگ جہاز ہے۔ یہ ابی امر ڈکوٹا آج بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ بالخصوص ان علاقوں میں جہاں فاصلے کم اور ہوائی اڈے معمولی درجہ کے ہیں۔ یہی کیفیت زیر تبصرہ کتاب کی ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک نہایت قابل قدر علمی کارنامہ تھا۔ اور اس وقت علم المعیشت کی تعلیم انگریزی زبان میں بھی بہت معمولی درجہ رکھتی تھی اور اس مضمون کے جاننے والوں کی تعداد نہایت محدود تھی۔ اردو میں ایک ایسی کتاب لکھنا جو اس مشکل مضمون کو عام فہم الفاظ میں بیان کر کے عوام کے لئے ایک نیا علمی ذخیرہ مہیا کر دے، ایک انتہائی قابل قدر کوشش تھی۔ جس کی اہمیت اور افادیت آج بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میری رائے تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنے معاشیات کے شوق کو ترک کر کے قوم پر ایک گونہ ظلم کیا ہے۔ اگر وہ معاشیات سے بھی اپنی دلچسپی کو برقرار رکھتے تو مسلمانوں میں ممتاز ماہرین معاشیات کا وہ فقدان نہ ہوتا، جو آج رونما ہے۔

''علم الاقتصاد'' اگرچہ ایک ابتدائی کتاب ہے۔ اور اقبال کی جوان سالی کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے۔ لیکن جہاں جہاں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اپنے زمانے کی معاشی صورت حال پر اپنی طرف سے تنقید کی

ہے۔ اس سے ان کی خداداد قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اور ان کی نظر کی وسعت ، رائے کی پختگی اور عالی دماغی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ ان کے معاشیات کے میدان میں بھی کام آتا ہے۔

چنانچہ ماہرین علم الاقتصاد کے فرائض بیان کرتے ہوئے وہ دو ایسے امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن پر اس علم کے ماہرین نے آج تک پوری توجہ نہیں دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ عملی نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔ اس سلسلے میں وہ ماہرین اقتصادیات کی توجہ مندرجہ ذیل فرائض کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:۔

(۱) انسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا جن کا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ہے۔

(۲) دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ہیں جن کا مقصود حصول دولت ہو۔ مثلاً ملی اور تمدنی رسوم، جدید ضروریات کا پیدا ہونا ، یا قوانین متعلقۂ زمین وغیرہ۔ وہ لکھتے ہیں ،، مگر ہماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ہیں۔ علم الاقتصاد کے لئے ضروری ہے کہ اول چند خاص اصول بطور بناء کے قائم کئے جائیں۔ اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے ان ابتدائی اصولوں میں عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے علم کی بنیاد انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں۔ ورنہ آن کو صحیح اور کلی نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بالطبع خود غرض ہے۔ یا اس کی فطرت قدرتاً وصف امتیاز سے کلی طور پر مبرا ہے اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیاجائے تو ظاہر ہے کہ تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائینگے غلط ہوں گے۔ کیونکہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم

کی نہیں ہے، بلکہ خود غرضی اور ایثار دونوں سے مرکب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط مشاہدے پر مبنی ہوں تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصے میں ہی ایک حیرت ناک تنزل کریگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خود غرضی اور زر پرستی کی بو آئیگی۔ جو اس کو کسی نہ کسی دن حضیض ذلت میں گرا کر چھوڑیگی "۔ اقبال نے جہاں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کی پختگی اور صحت سے کسی صائب الرائے کو انکار نہیں ہو سکتا۔ شروع صدی میں جب اس ملک میں معاشیات کی تعلیم کا رواج ہوا تو اکثر و بیشتر ہندوستانی علماء نے ہندوستان کے معاشی مسائل کو عام معاشی مسائل سے مختلف قرار دیتے ہوئے معاشیات ہند کو ایک جداگانہ علم کی حیثیت قرار دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں:۔

"ایک مصنف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کو اس نے "اقتصاد ہندی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریق عمل پر مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے جس کا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لئے خاص خاص قواعد اور طریق عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علم الاقتصاد کا یہ کام نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے لئے کوئی خاص طریق عمل پیش کرے یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ہیں۔ اگر چہ یہ تسلیم کرنے میں ہمیں عذر نہیں ہے کہ اس سے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ہے جس سے ان کی وسعت زیادہ ہو جائے اور ان کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔" راقم الحروف کی

رائے میں اگر ہندوستانی اور پاکستانی ماہرین معاشیات اس رمز کو شروع ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے (بعض تو اب تک بھی اسے نہیں سمجھے) تو ملک میں معاشی مسائل کا علم اس قدر پست اور پسماندہ نہ رہتا ۔

''علم الاقتصاد'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے اس مضمون کا مطالعہ کرنے میں خاصی عرق ریزی سے کام لیا تھا اور اس میں اس قدر دسترس حاصل کرلی تھی کہ وہ رائج الوقت نظریوں پر ناقدانہ نگاہ ڈال سکیں ۔ مثلاً اس وقت کی مروجہ کتابوں میں اجرتوں کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ اجرتیں ایک مخصوص ذخیرہ سے ادا کی جاتی ہیں ۔ اور اگر اجرتیں بڑھادی جائیں تو یہ ذخیرہ کم ہو جائے گا ۔ جس سے بالآخر مزدور متاثر ہوں گے ۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس نظریہ پر تنقید شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ اقبال نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸۹ پر اس نظریے کے خلاف امریکہ کے مشہور مصنف واکر کے دلائل پیش کئے ہیں جس سے ان کی وسعت نظر اور گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ غالباً اس قسم کی تحریریں پڑھنے کا نتیجہ تھا جس نے بعد میں یہ شعری صورت اختیار کی ۔

جس کھیت سے دھقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ' گندم کو جلا دو

جوانی میں بھی اقبال کی نظر وسیع تھی اور وہ بنیادی مسائل پر زور دیتے تھے ۔ مزدوروں کی بہتری و خوش حالی اور قومی ترقی کے سلسلے میں ان سطور پر غور فرمائیے ۔

,, مگر ہمارے نزدیک کمی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر' اس کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے ، اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے ۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے ۔ اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے ۔ اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے' جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے ،، ۔

آبادی کا مسئلہ آج کل دنیا کی مختلف حکومتوں اور ماہرین معاشیات کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں جبکہ ہندوستان کی آبادی صرف ۲۹ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی اور آبادی کا مسئلہ کچھ ایسا تشویشناک نہ تھا ' وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیویاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے۔ اور کچھ یہ کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا کہ اس سے جنگ و جدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے دیگر قبائل پر غلبہ رہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اقتصادی لحاظ سے تعدد ازواج تمدن کی ہر صورت میں مستحسن ہے۔ کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہے۔''

آگے چلکر وہ لکھتے ہیں :—

''تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں۔ مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کی آراستگی اور ان کے نقشی و نگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے۔ لہذا انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوت توالد و تناسل کو بھی کفایت شعاری سے برتنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بیٹوں کی شادیاں نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہو لیں۔ بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرک یہی امر ہوتا ہے کہ بیٹے کی شادی ہو گئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائیگی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرض التوا میں ڈالنا

گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے۔ جو بصورت دیگر ایام کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی۔ علاوہ برین تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کی خور و نوش اور طرح طرح کے اسباب تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے جو اسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور اس کی قوت تناسل و توالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارہ کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے۔ اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے۔ علی ہذا القیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خود کاشت میں منقسم ہے زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہو گی۔ اسی قدر ان کی جائداد زیادہ حصوں میں منقسم ہو گی اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونی شروع ہو گئی تو حصہ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گزارے کے لئے کسی طرح کافی نہ ہو گی۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ افزائش آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جبکہ زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی ہو۔ یا بالفاظ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ سامان معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہو سکے گی۔ ان اصول کی رو سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے۔ مگر ہم کو بھی چاہئے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دور اندیشی سے صرف کریں صنعت و حرفت کی طرف توجہ کر کے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہو کر تہذیب و تمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جن کے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے۔ ان سطور سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔

ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم مقدار پیدا ہو۔ اور بیوی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو۔ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

یہ چند نمونے میں نے صرف اس بات کی وضاحت کے لئے پیش کئے ہیں کہ اہم معاشی مسائل کے متعلق اقبال کی رائے کس قدر صائب تھی۔ اور وہ مسائل جو آج ملک کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں اقبال نے ساٹھ سال پہلے ان پر کس خوبی سے روشنی ڈالی تھی۔

اس مختصر مقدمہ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ میری رائے میں اقبال اکیڈمی نے اس کتاب کو شائع کر کے اقبال کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں کیا ہے جو پہلے عوام کے سامنے نہ تھا۔ کتاب کی اشاعت موجودہ دور میں بھی معاشیات کے ابتدائی طالب علموں اور ان پڑھے لکھے لوگوں کے لئے جو اس مضمون سے متعارف ہونا چاہتے ہیں نہایت مفید ہے۔

انور اقبال قریشی

۲۔ اے کوینز روڈ
کراچی
۲۶ اپریل ۱۹۶۱ء

پیشکش

اس دلی ارادت کے سبب جو مختصر سے زمانہ تلمذ میں مجھے عالی جناب ڈبلیو۔ بل اسکوئر۔ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں پیدا ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی کرسی صدارت پر رونق افروز تھے، اور اس عالم گیر شہرت کے باعث جو صاحب ممدوح کو بحیثیت مربی علوم و فنون حاصل ہے، میں اس نا چیز کتاب کو جو میری علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے صاحب موصوف کے نام نامی سے منسوب کرنا چاہتا ہوں اور اس امید پر کہ یہ ہدیۂ محقر شرف قبول پائیگا، نہایت ادب سے اسے پیشکش کرتا ہوں۔

مصنف

دیباچہ مصنف

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ھے اور اسکا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ھے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ھیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ھیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اسکا موضوع دولت ھے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ھے جسکا موضوع خود انسان ھے۔ یہ امر مسلم ھے کہ انسان کا معمولی کام کاج اس کے اوضاع واطوار اور اسکے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ھے۔ بلکہ اسکے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذھب بھی بے انتہا موثر ثابت ھوئے ھیں،[1] مگر یہ بات بھی روز مرہ کے تجربے اور مشاھدے سے ثابت ھوتی ھے کہ روزی کمانے کا دھندا ھر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ھے اور چپکے چپکے اسکے ظاھری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رھتا ھے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ھونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ھوتا ھے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ھے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کردیتی ھے کہ اخلاق اور تمدنی لحاظ سے اسکا وجود و عدم برابر ھو جاتا ھے۔ معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ھے، مگر مذھب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ

---

[1] اصل عبارت میں کتابت یا طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے مطلب خلط ملط ھو گیا تھا۔ متن میں یہ الفاظ تھے ''اصول مذھب بھی انتہا درجہ کا موثر ثابت ھوا ھے''۔ (مرتب)

تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کی لئے ایک ضروری جزو ہو اس کی تخریب کرتا ہے ۔ اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے ۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے ؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو ؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اسکے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے کے لئے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے ۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرہ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لئے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اسکا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہل ہندوستان کے لئے تو اس علم کا پڑھنا اور اسکے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے بالکل نا واقف ہے جنکا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں انکا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بروده نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے۔ اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہل ہندوستان دفتر اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں ۔ میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث

کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھونگا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اورمستند کتب سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پرپورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہو گا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانۂ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہو گا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جسکو بامذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب، دستکاری اور محنت، دستکار اور محنتی، نفع اور منافع، ساہوکار اور سرمایہ‌دار مالک و کارخانہ‌دار مرادف استعمال کئے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا

استعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی ۔ علیٰ ہٰذالقیاس لفظ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ہے جہاں مبادلہ اشیاء زرنقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظ مبادلہ اس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شئے دوسری شئے کے عوض میں دی جائے ۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائفہ سے ظاہر کیا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے، اسواسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جنکے فیضان صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین ۔ بی ۔ اے کینٹب۔ بیر سٹرایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیئے ۔ اسکے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولٰنا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی ۔

محمد اقبال

حصہ اول

علم الاقتصاد کی ماھیت

اور

اسکا طریق تحقیق

باب اول

علم الاقتصاد کی ماهیت اور اسکا طریق تحقیق

علم الاقتصاد علم انسانی کے اُس خاص حصے کا نام ہے جسکا موضوع دولت [1] ہے۔ اور جسکا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ دولت کی پیدائش تقسیم ، تبادلے اور استعمال کے اُصول و اسباب و طریق کیا کیا ہیں۔ لہٰذا اس علم کے طالب کا یہ فرض ہے کہ اپنی تحقیق و تدقیق کو دیگر علوم کی تحقیق سے مخلوط نہ کرے۔ کیونکہ کسی علم کی ترقی اس امر پر منحصر ہے کہ اُسے دیگر علوم کے سلسلہ سے منفرد سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ بعض حکماء کی یہ رائے ہے کہ علم الاقتصاد وسیع علم تمدن کا ایک جزو ہے۔ اور چونکہ تمدنی زندگی کی عام صورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس واسطے ان میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ کرنا کچھ نتیجہ خیز نہ ہو گا۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ انسانی افعال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ علمی نظر کامل طور سے اسکا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسکے علاوہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، کسی علم کے علم بننے کے لئے اُسکی تخصیص [2] ضروری ہے۔

---

[1] دولت (Wealth) معاشیات کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح مصنف نے بعد میں کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶، ۷ (مرتب)

[2] تخصیص : Specialisation (مرتب)

کیا علم الاقتصاد کا مطالعہ دولت کی محبت پیدا کرتا ہے؟ بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ اس علم کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے مفید نہیں ہے کیونکہ اس سے دولت کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کو تمام اخلاقی نیکیوں کے ناقابل کر دیتی ہے۔ اور اسے ایک سنگدل دنیا دار بنا دیتی ہے۔ اس لغو اعتراض کے جواب میں اول تو ہم[3] یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ انسان کی غرض صرف دولت ہی نہیں ہے تاہم یہ بڑی ضروری اغراض میں سے تو ہے ۔ اور اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جاوے ۔ اور اس کی پیدائش و تقسیم وغیرہ کے اسباب و طریق معلوم کئے جائیں ۔ اس کے علاوہ یہ بھی[4] کہا جا سکتا ہے کہ سرے سے یہ اعتراض ہی صحیح نہیں ہے۔ علم الاقتصاد کے مطالعہ سے دولت کی محبت نہیں پیدا ہوتی ۔ کیونکہ اسکا مقصد تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ حصول دولت کی خواہش جیسا کہ انسانی فطرت میں موجود ہے، انسانی افعال پر کس طرح اثر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض میلان طبائع ایسے قوی ہوں کہ حصول دولت کی خواہش کو دبائے رکھیں ۔ مگر علم اقتصاد کو ان سے تعلق نہیں ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے چال چلن پر رائے زنی کرے۔ یا یہ فیصلہ کرے کہ کون کون سے محرکات افعال اخلاقی لحاظ سے اچھے ہیں اور کون کون سے برے ۔ یہ علم انسانی افعال کے وسیع دائرہ کے صرف اس حصہ پر غور کرتا ہے جس کا تعلق حصول دولت سے ہے۔ مزید برآں اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ علم اقتصاد حرص کی تعلیم نہیں دیتا ۔ بلکہ حصول دولت کے صحیح اور مسلم اصولوں پر روشنی ڈالنے سے انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اس قوی خواہش کو ان اصولوں کے تحت میں رکھے ۔ اور جنگ و جدل لوٹ مار وغیرہ سے جو اس زبردست خواہش کا ضروری نتیجہ ہوا کرتے ہیں[5]، احتراز کر کے امن و صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

---

[3] اصلی متن میں ''ہم'' رہ گیا تھا، جس کی وجہ سے جملہ غیر مربوط ہو گیا تھا۔ یہاں ''ہم'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

[4] یہاں ''بھی'' رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

[5] متن میں ''ہیں'' لکھنے سے رہ گیا تھا۔ (مرتب)

ہم نے لفظ ''دولت'' کئی جگہ استعمال کیا ہے[6] ۔ مگر ابھی تک یہ بیان نہیں کیا کہ اُس کی ماہیت اور تعریف کیا ہے ۔ دولت میں وہ ممکن الحصول اشیاء شامل ہیں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ انسانی ضروریات کو پورا کریں اور جنکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے ۔ مگر ظاہر ہے کہ ہر ممکن الحصول شے جسکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جائے دولت نہیں ہے ۔ مثلاً ہر شخص یہ خواہش کرتا ہے کہ اُس کے دوست اُسکے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں ۔ مگر یہ محبت دولت نہیں ہے ۔ پس اجزائے دولت کو معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اشیاء مطلوب کو معلوم کیا جائے ۔ مطلوب اشیاء[7] یا وہ تمام اشیاء جنکی ہر انسان جائز اور مناسب طور پر خواہش کر سکتا ہے ' دو قسم کی ہوتی ہیں ۔

(۱) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی جن میں تمام مفید اشیاء اور اُن کے حقوق استعمال شامل ہیں ۔ مثلاً زمین ' پانی ' آب و ہوا ' زرعی پیداوار ' معدنی پیداوار ' مصنوعات ' تعمیرات ' کانیں ' اوزار ' رہن نامجات ' پٹے ' وغیرہ ۔

(۲) اشیاء ممکن الحصول غیر مادی یا ذاتی ۔ اس ضمن میں دو قسم کی اشیاء شامل ہیں ۔

اول تو وہ فوائد جو انسان اوروں سے حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ مثلاً حق خدمت ملازمین ۔

دوئم اس کے ذاتی اوصاف یا قابلیتیں جنکی وجہ سے وہ اپنے کاموں کو سر انجام دیتا[8] ہے ۔ مقدم الذکر کو اشیاء غیر مادی خارجی کہتے ہیں ۔

---

[6] اصل متن میں الفاظ کی ترتیب بگڑ گئی تھی ' جسے یہاں درست کردیا گیا ہے ۔ (مرتب)

[7] یہاں لفظ ''اشیاء'' محذوف تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے (مرتب)

[8] اس مقام پر اصل متن میں غالباً کاتب کے سہو کی وجہ سے ''کرتا'' لکھا ہوا تھا اسے ''دیتا'' سے تبدیل کر دیا گیا ہے جو محاورہ کے مطابق ہے ۔ (مرتب)

اور مؤخرالذکر کو اشیاء غیرمادی اندرونی - اسکے علاوہ اشیاء مطلوب قابل انتقال ہوتی ہیں یا ناقابل انتقال - مثلاً انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قویٰ یعنی اشیاء غیر مادی اندرونی - روشنی ' ہوا یا وہ حقوق جو اسکو بہ حیثیت ایک خاص ملک کا باشندہ ہونے کے حاصل ہیں[9] -

اشیاء مطلوب کی تقسیم اور طرح سے بھی ہو سکتی ہے - یعنی اشیاء آزاد[10] اور اشیاء قابل تبادلہ[11] - اشیاء آزاد سے مراد اُن اشیاء کی ہے جو نظام قدرت خود بخود مہیا کرتا ہے - اور انسان کو اُن کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش نہیں کرنی پڑتی -

اشیاء قابل تبادلہ میں وہ تمام اشیاء قابل انتقال شامل ہیں جنکی مقدار محدود ہو - مگر یہ امتیاز عملی لحاظ سے کچھ بڑی وقعت نہیں رکھتا -

اب اصطلاح ''دولت'' کا مفہوم بالصراحت واضح ہو جائیگا - جب ہم کسی شخص کی نسبت لفظ دولت کا اطلاق کرتے ہیں تو اُسکے معنوں میں دو قسم کی اشیاء مطلوب شامل سمجھی جاتی ہیں -

اول وہ ممکن‌الحصول اشیاء مادی و خارجی جن پر اسکو قانوناً یا رواجاً حق ملکیت حاصل ہے اور جو اس وجہ سے قابل انتقال اور قابل تبادلہ ہیں -

دوم وہ ممکن‌الحصول اشیاء غیر مادی و خارجی جو اسکی ملکیت میں ہوں اور جنکی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جا سکیں - مثلاً کسی شخص کے تجارتی تعلقات وغیرہ - ظاہر ہے کہ ''دولت'' کے مندرجہ بالا مفہوم میں انسان کے فطری قویٰ شامل نہیں ہو سکتے - کیونکہ یہ اُس کی ذات سے خارج نہیں ہیں - بلکہ اُس کی ذات میں داخل ہیں - یا یوں کہو کہ یہ اشیاء غیر مادی اندرونی ہیں - جو محاورہ متعارف کے رو[12] سے دولت

---

[9] یہ تمام ناقابل انتقال اشیاء مطلوب کی مثالیں ہیں - (مرتب)

[10] اشیاء آزاد : Free Goods (مرتب)

[11] اشیاء قابل تبادلہ : Exchange Goods (مرتب)

[12] اصلی متن میں ''روے'' لکھا تھا - اسے صحیح کر دیا گیا ہے (مرتب)

میں شامل نہیں - پس دولت کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ ان اشیاء مطلوبہ میں داخل ہو جو ممکن الحصول ہوں اور جنکی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکے - مگر ظاہر ہے کہ بعض اشیاء ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں مگر دولت نہیں کہلا سکتیں - مثلاً مذاق صحیح ' خاندانی محبت ' یا تعلقات وغیرہ - لہٰذا دولت کی کامل تعریف کے لئے کسی اور ایسے خاصہ کا معلوم کرنا ضروری ہے جو اسکو دیگر اشیاء سے متمیز کرے - یہ خاصہ قابلیت انتقال یا قدر کا زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتا ہے - پس دولت سے مراد ان خارجی اشیاء کی ہے جنکی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے اور جو انسان کی ذاتی ملک ہوں - اور جنکی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو - یہ پیمانہ ایک طرف تو اس سعی و کوشش کو ظاہر کرتا ہے - جس کی وساطت سے یہ اشیاء پیدا ہوئی ہوں - اور دوسری طرف ان انسانی ضروریات کو جنکو یہ پورا کرتی ہیں - مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ ''دولت'' میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے وہ تمام جائز و مناسب اور ممکن الحصول وسائل داخل ہیں جو بالفعل یا بالقوۃ قابل انتقال ہوں - اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہی شے دولت کہلا سکتی ہے -

(۱) جو کوئی خاص شے ہو - خواہ مادی خارجی ہو ' خواہ غیر مادی خارجی -

(۲) جس کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکتی ہو - افریقہ کا ایک وحشی اپنے دشمن کے سر کی خواہش کر سکتا ہے - مگر یہ خواہش اخلاقی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں ہے -

(۳) جو ممکن الحصول ہو -

(۴) جس پر انسان کو حق ملکیت حاصل ہو -

(ہ) جس میں قابلیت انتقال ہو - یا یوں کہو کہ جس کی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو -

دولت* کی مندرجہ بالا تعریف میں ہم نے لفظ ''قدر''[13] کو استعمال کیا ہے - جو علم اقتصاد کی ایک ضروری اصطلاح ہے - دولت کی تعریف کماحقہ سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس اصطلاح کا مفہوم ذہن نشین ہو - فرض کرو کہ میرے پاس ایک گھڑی ہے - میں اسے بیچ کر اپنی ضروریات پورا کرنے یا اوروں سے خدمت لینے کی قدرت رکھتا ہوں - یہ قدرت مجھے کہاں سے حاصل ہوئی ؟ صرف اس گھڑی کی وساطت سے - اگر یہ شے میرے پاس نہ ہوتی تو مجھ میں یہ قدرت بھی نہ ہوتی - پس ''قدر'' اس قدرت یا قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل

---

۱۳ - مصنف نے ''قدر'' کے لفظ کو قدر در تبادلہ (Value-in-Exchange) کے معنی میں استعمال کیا ہے اور علم معاشیات میں یہی اس کا معروف استعمال ہے - نیز آپ نے اسے قوت خرید و مبادلہ (Purchasing power) کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے - جدید رجحان یہ ہے کہ Purchasing power کیلئے قوت خرید اور value کیلئے قدر کی اصطلاحات استعمال کی جائیں - ملاحظہ ہو ''فرہنگ اصطلاحات علمیہ'' جلد دوئم - انجمن ترقی اردو ہند دہلی - (۱۹۴۰) صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۴۷ - و ''فرہنگ اصطلاحات بنکاری'' مرتبہ مجلس اصطلاحات بنک دولت پاکستان - صفحہ ۱۵۰ اور صفحہ ۱۸۹ (مرتب)

(حاشیہ از مصنف)* فلسفہ تمدن کا فرض منصبی یہ ہے کہ انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد معلوم کرے - لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف وسائل اور قابل عمل طریق معلوم کرنا اس علم کا کام نہیں ہے بلکہ یہ کام علم الاقتصاد، فن تعلیم اور علم تدبیر مملکت کا ہے - تحقیقات تمدنی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تمدن کی ترقی کے لئے تین ضروری شرائط ہیں -

(۱) نظام قدرت کے قویٰ مخفیہ کو معلوم کرنا اور ان سے مستفید ہونا - مثلاً زمانہ حال میں برقی قوت سے جو نظام قدرت کے قویٰ میں سے ہے، انسان نے بے انتہا فائدہ اٹھایا ہے -

ھوتی ھے - اور جس کو تبادلے میں دیکر وہ شخص بلالحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ھے۔ مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ قدر قوت تبادلہ کا نام ھے۔ اس تعریف کے الفاظ پر غور

حاشیہ متعلقہ (صفحہ ۸)

(۲) تمدنی تعلقات کی تکمیل - مثلاً میاں بی بی کا رشتہ بعض اقوام کے نزدیک ٹوٹ ھی نہیں سکتا - بعض اسکو ایک معمولی معاھدہ سمجھتے ھیں - انسانی تمدن کی ترقی کے لئے ضروری ھے کہ تمام تمدنی تعلقات کے صحیح مفہوم معلوم کر کے ان کے مطابق عملدرآمد کیا جائے -

(۳) افراد کے ذاتی قویٰ کی ترقی - مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ - نمبر۲ و ۳ کی تحقیقات اور بحث علم تدابیر مملکت اور فن تعلیم کے متعلق ھے۔ مگر چونکہ نمبر ۱ کی تحقیق علم الاقتصاد کا فرض ھے اسواسطے اس ضمن میں چند سطور لکھنا ضروری ھیں - بعض لوگوں کی رائے میں نظام قدرت کے مخفی قویٰ کے معلوم کرنے سے انسانی زندگی میں ایک قسم کا تصنع اور بناوٹ آ جانے کا اندیشہ ھے جو اسکی فطرت صحیحہ کے مخالف ھے۔ مگر حقیقت یہ ھے کہ انسان فطرتاً ایک ایسی ھستی ھے جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد مقرر کرتی ھے۔ اور پھر اسی کے اعتبار سے اپنے عمل کو متعین کرتی ھے - پس اس لحاظ سے ھر کامل انسانی زندگی میں تصنع کا آنا ضروری بلکہ لازمی ھے - اس قسم کے اعتراضوں سے ھمیں یہ فائدہ اٹھانا چاھئے کہ نظام قدرت کے ان مخفی قویٰ کو معلوم کریں جو حقیقتہً ھمارے لئے مفید ھیں - مثلاً لفظ ”دولت“ کا اصل مفہوم معلوم کرنا - اور ان اسباب کو معلوم کرنا جن کی وساطت سے دولت پیدا ھوتی ھے - ”تاریخ علم الاقتصاد“ کے مطالعہ سے معلوم ھوتا ھے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کئی تغیر آئے ھیں - اور یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مفہوم صحیح اور آخری ھو - جس میں اب کوئی تغیر آنیکا امکان نہیں ھے۔ ایک زمانہ میں سمجھا جاتا تھا کہ دولت اور زرنقد مرادف الفاظ ھیں - اس غلط مفہوم سے ایک ایسا مغالطہ پیدا ھوا - جسکو نظام تجارت[14] کے

---

[14] نظام تجارت : Mercantilism (مرتب)

کرو ۔ ہم نے کہا ہے بلا جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی ۔ کوئی مطلق العنان بادشاہ اپنی رعایا کو جہاں چاہے لڑنے مرنے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ مگر یہ خدمات علم اقتصاد کے دائرہ میں نہ آئینگی۔ کیونکہ ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹)

نام سے موسوم کیا جاتا ہے مختلف ممالک کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دیگر ممالک سے اشیاء کا خریدنا گویا اپنے ملک سے زرنقد کا باہر نکالنا ہے۔ اس خیال سے حتی المقدور اپنی اشیاء فروخت کرتے تھے اور دیگر ممالک کی اشیاء پر اسقدر محصول لگا دیتے تھے کہ وہ ملک میں بکنے ہی نہ پاویں ۔ اس مغالطہ کو پہلے ایڈم اسمتھ صاحب نے ظاہر کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ ان مادی اشیاء کا مجموعہ ہے جو انسان کے لئے مفید ہیں ۔ جب تک یہ خیال قائم رہیگا ۔ دولت ایک قسم کی مادی شے تصور کی جائیگی اور ان اشیاء کے برخلاف ایک قسم کا تعصب پیدا ہوتا جائیگا جو انسانی حاجات کو رفع تو کرتی ہیں لیکن بادی النظر میں ہمارے وسائل زندگی کو زیادہ نہیں کرتیں ۔ مثلاً بڑے بڑے صناعوں کی کھینچی ہوئی تصویریں ۔ آخر یہ تعریف بھی مقبول نہ ہوئی اور محققین علم اقتصاد کو بتدریج یہ محسوس ہوتا گیا کہ مادے کی مختلف اقسام کی قدر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مندرجہ بالا تعریف میں اشیاء کی جگہ ''مفیدات''[15] کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا ۔ اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ آن مفیدات کا مجموعہ ہے جو انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تعریف بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے ۔ کیونکہ لفظ ضرورت کا مفہوم مشکوک ہے۔ ممکن ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ضرورت سمجھے ہوئے ہیں ۔ حقیقت میں ہماری ضرورت نہ ہو ۔ اگر ہماری ظاہری ضروریات ہمیں بربادی کی طرف لے جاویں تو آن ضروریات کو پورا کرنے کے اسباب ہرگز دولت نہیں قرار دیئے جا سکتے ۔ لہٰذا دولت کا اصل مفہوم معلوم کرنے سے پیشتر ہمیں اپنی حقیقی اور ظاہری ضروریات کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے ۔ یہاں ایک اور مشکل پیش آتی ہے۔

---

[15] مفیدات سے مراد Utilities ہے (مرتب)

بنا جبر و اکراہ پر ہے۔ بر خلاف انکے انگریزی سپاہی کی خدمات دائرہ علم اقتصاد میں داخل ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی سے ایک خاص تنخواہ کے عوض فوجی خدمت قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اس ماں کی خدمات بھی دائرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰)

انسان کی حقیقی ضروریات اُس کی ظاہری ضروریات سے متمیز نہیں ہوسکتیں۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ انسان کی حقیقی بہبودی کیا ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج اور حالات میں دولت کی مختلف اقسام کی وقعت ہوتی ہے۔ اور اُن کی قدر صرف اُن ضروریات کے لحاظ سے متعین نہیں ہوتی جنکو وہ پورا کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ انسان انکو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا اثر بالعموم ہماری نگاہ میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دیتا ہے اور بسا اوقات ہم اُن اشیاء کو دولت نہیں سمجھتے جنکو تعلیم پانے سے پہلے دولت تصور کیا کرتے تھے۔ غرض عملی طور پر مفید ہونے کے لئے علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام علوم کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھائے جن کا مدعا انسان کی زندگی کا افضل ترین مقصد اُس کی حقیقی بہبودی اور اُس کی تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج معلوم کرنا ہے۔ موجود حالات میں جہاں تک ہمیں ان امور کا علم حاصل ہے ہم کہہ سکتے کہ ضروریات زندگی دو قسم کی ہوتی ہیں۔

اول وہ اشیاء جو قیام زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

دوم وہ اشیاء جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ مثلاً گاڑی گھوڑا رکھنا بعض حالات میں محض فضول خرچی ہے لیکن بعض حالات میں ضروریات سے ہے۔ اگر ہر مطلوب شے کو جو ان ہر دو اقسام میں نہیں آتی اسباب تعیش و تنعم یا تن آسانی میں داخل سمجھا جاوے تو ظاہر ہے کہ اسباب تعیش میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہونگی۔

(۱) وہ تمام اشیاء جو ان اشیاء سے مشابہ تو ہیں جو اوپر کی ہر دو اقسام میں آتی ہیں تا ہم معمولی حالات میں نہ ضروریات زندگی میں سے ہیں نہ اُن اشیاء میں سے ہیں جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات میں ضروری ہیں۔

علم اقتصاد سے خارج ہیں جو اپنے بیمار بچے کی حفاظت میں بعض دفعہ جان بھی دیدیتی ہے۔ کیونکہ اسکی بنا ذاتی تاثرات یا محبت پر ہے۔

اس تعریف کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ ''قدر'' قوت تبادلہ کا نام ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے تعین کے لئے تبادلہ ضروری ہے ۔ مگر تبادلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی اور

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۱)

(۲) وہ تمام اشیاء جو بالعموم مطلوب تصور کی جاتی ہیں ۔ مگر انسان کی بہبودی کے لئے ضروری نہیں ہیں ۔

(۳) وہ اشیاء جن سے ایک قسم کی عارضی لذت حاصل ہوتی ہے تاہم انسانی بہبودی پر آن کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

(۴) وہ اشیاء جوبالواسطہ یابلاواسطہ انسانی زندگی کوایک اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً کتابیں اور فن مصوری کے کرشمے ۔

پہلی قسم کی قدر کافی طور پر واضح ہے ۔ کیونکہ انسان اپنے کاروبار میں فطرتاً کسی قدرآسائش کو بھی چاہتا ہے ۔ دوسری اور تیسری قسم کچھ وقعت نہیں رکھتی ۔ خصوصاً جبکہ ان اقسام کی اشیاء کا حاصل کرنا ان اشیاء کے حصول سے متناقض ہو، جو اعلیٰ تر وقعت رکھتی ہیں ۔ ہاں چوتھی قسم کی اشیاء پر غور کرنا ضروری ہے ۔ ان میں سے بعض مثلاً کتابیں وغیرہ انسانی ترقی کے لئے اس قدر ضروری ہیں کہ بعض انسان ان کے لئے اصل ضروریات زندگی کوترک کرنا گوارا کریں گے ۔ مگر ان اشیاء کو تیسری قسم کی اشیاء سے متمیز کرنا ذرا مشکل ہے ۔ بعض اشیاء جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں ۔ لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے کہ بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور ان اشیاء سے بے پروا رہنے کی وجہ سے ہوئی ۔ جن سے انسانی زندگی کو حقیقی موت اور جلا حاصل ہوتی ہے ۔ زمانہ حال کی تہذیب اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے ۔ اور اس امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے افعال و اعمال کو مرتب کیا جائے تاکہ ہمیں اپنی زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودی بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو ۔

فرد بھی ہو جس کے ساتھ تبادلہ اشیاء کیا جاوے ۔ اب اس تعریف کے لحاظ سے دیکھو کہ آیا عقل ' ہنر اور فطری قویٰ کو جنہیں انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حامل قدر کہا جاسکتا ہے[16] ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اشیاء ناقابل انتقال ہیں ۔ یا بالفاظ دیگر ان کا تبادلہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ انسان کی ذات سے منفک نہیں ہو سکتے - بعض حکماء کا قول ہے کہ چونکہ قدر کے لئے اشیا میں قابلیت انتقال کا ہونا ضروری ہے اس واسطے ذاتی اوصاف قدر سے معرا ہیں اور دولت میں شامل نہیں ہیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قویٰ میں قابلیت انتقال نہیں ہے تاہم ان کے استعمال میں یہ قابلیت موجود ہے ۔ ہم اپنے فطری قویٰ کو کسی اور شخص کی خاطر استعمال کر کے اس سے حق الخدمت حاصل کر سکتے ہیں ۔ بڑھئی کا ہنر نہ صرف اوروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے ۔ بلکہ بالواسطہ اس کی اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے بھی ایسا ہی لازمی ہے جیسا کہ اس کے اوزار وغیرہ - یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے محاورہ متعارف کی رو سے اگرچہ لفظ ''دولت'' کا اطلاق اشیاء خارجی پر کیا ہے ۔ تاہم انسان کے فطری قویٰ کو اس کی ذاتی دولت[17] کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ اس رائے کے لحاظ سے کسی ملک کے لوگوں کا ہنر ' دیانت داری وغیرہ بھی اس ملک کی دولت میں شامل ہیں ۔ مگر بعض اہل الرائے نے بغیر کسی امتیاز کے ذاتی دوات کو بھی دولت متعارف میں داخل سمجھا ہے ۔ ان کے نزدیک دولت میں تین قسم کی اشیاء داخل ہیں ۔

(۱) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے - اور جن پر انسان کو قانوناً یا رواجاً حق ملکیت حاصل ہو ۔

(۲) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے ۔ اور جو اس کی ملکیت میں

---

[16] یہاں مفہوم کو واضح کرنے کے لئے الفاظ کی نشست اور جملہ کی ترتیب میں معمولی تبدیلی کرنا پڑی ہے ۔ متن میں جملہ اس طرح تھا : ''آیا عقل ہنر اور فطری قویٰ جن کو انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے قدر کہتے ہیں ؟'' (مرتب)

[17] ذاتی دولت Personal Wealth (مرتب)

ہوں ۔ اور جن کی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جاسکیں ۔ مثلاً حقوق خدمت ملازمین اور تجارتی تعلقات وغیرہ ۔

(۳) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی اندرونی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے۔ مثلاً انسان کے فطری قویٰ ۔ ہمارے نزدیک پہلی رائے زیادہ قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ دونوں میں صرف ایک لفظی فرق ہے۔ معنوی فرق کوئی نہیں ۔ قدر کے بیان سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ دولت اور بہبودی مرادف الفاظ نہیں ہیں ۔ اکثر اشیاء ہماری بہبودی کے لئے ضروری ہیں ۔ تاہم دولت کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں ۔ مثلاً اگر آزاد دستکاروں کو غلام تصور کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کی مقدار میں اضافہ ہوگا ۔ مگر انسان کی بہبودی کے لئے یہ امر مضرت رساں ہوگا ۔ اسی طرح دولت کی مقدار کا مسئلہ ہے۔ بعض دفعہ کچھ عرصہ کے لئے ایسے اسباب فراہم ہوجاتے ہیں جو ملکی ترقی کے لئے مد ہوں ۔ مثلاً کانوں کی ایجاد سے چھوٹے چھوٹے اوزار استعمال کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ ملکی ترقی کا انحصار بہت کچھ اس قسم کی ایجادات پر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ دولت کی مقدار دن بدن کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اگر آبادی بڑھتی نہ جاتی اور انسانی ضروریات اور حاجات کا دائرہ دن بدن وسیع نہ ہو جاتا تو علم الا قتصاد کے موضوعات کا احاطہ بھی تنگ ہوتا جاتا ۔ یہاں تک کہ اس علم کی ضرورت ہی نہ رہتی ۔

اس ضمن میں یہ واضح کر دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے کہ ''دولت،، اور ''جائداد،،[18] بھی ہم معنی الفاظ نہیں ہیں ۔ کیوں کہ اس امتیاز کا علم

---

[18] دولت Wealth اور جائداد Property کے لئے مستعمل ہیں (مرتب)

محصول آمدنی [19] کی بحث میں کام آئے گا ۔ فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین ایک شخص کے لئے تو دولت ہو گی ؛ جو اس کا لگان وصول کرتا ہے اور جو اپنے قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے بیچ کر اپنی رقم وصول کر کر سکتا ہے ۔ مگر ملک کے لئے یہ زمین دولت نہ ہو گی ۔ کیوں کہ اگر فک الرھن ہو جائے تو ملک کی دولت میں کوئی تغیر نہ ہو گا ۔ اس امتیاز کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زمین مذکورہ تو دولت ہے ۔ کیوں کہ ایک خاص معین قدر رکھتی ہے ۔ مگر رھن دولت نہیں ۔ بلکہ جائداد یا دولت کی ایک خاص مقدار کو حاصل کر سکنے یا استعمال میں لا سکنے کا حق ہے ۔ جو مرتہن کو حاصل ہے ۔ یعنی مالک زمین کی جائداد کی مقدار اس زمین کی قدر منفی حق مرتہن کے برابر ہے ۔ اس مثال میں دولت تو ایک ہی ہے ۔ مگر جائدادیں دو ہیں ۔ ایک تو اصل مالک کی جائداد، دوسری مرتہن کی ۔ زمین کی ملکیت خواہ ایک ہو خواہ کئی جائدادوں پر منقسم ہو، ملک کی دولت میں کوئی تغیر واقع نہ ہو گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الاقتصاد کو لفظ جائداد سے سروکار نہیں ہے ۔ کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم اقتصادی نہیں، بلکہ قانونی ہے ۔

علم الاقتصاد کی ماہیت کو واضح کرنے کے لئے اصطلاحات ''دولت'' و ''قدر،، کے معنی کا بالصراحت بیان کرنا ضروری تھا ۔ اس واسطے مندرجہ بالا سطور ہم کو لکھنی پڑیں ۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں ۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ علم الاقتصاد کے اصول ابتدائی کیا کیا ہیں ۔ اس ضمن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً وہ اصول اولیہ اور واقعات کیا ہیں جن کی بنا پر علم الاقتصاد کا ماہر اپنے استدلال کو قائم کرتا ہے ؟ کیا اس استدلال میں ان تمام واقعات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ جو دولت پر اثر کرتے ہیں ۔ یا صرف چند ضروری واقعات پر قناعت کرنی چاہئے ؟ کیا نتائج کلیہ پر پہنچنے کے لئے انسان کی حقیقی فطرت کا مطالعہ لازم ہے ؟ یا اس غرض کے لئے ہمیں ایک خیالی انسانی فطرت کا تصور کرنا چاہئے ۔ جس کا ہر فعل اوروں کے لئے نمونہ ہو ؟

---

[19] مراد Public Revenue سے ہے ۔ (مرتب)

کیا مختلف ممالک کے حالات زمین و آب و ھوا اور زرعی قابلیت اور لوگوں کے عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کا معلوم کرنا ضروری ھے۔ یا صرف انھیں حالات و اوصاف کا علم ضروری ھے جو بالاشتراک ھر قوم میں پائے جاتے ھیں ؟ ان سوالوں کے جواب پر علم اقتصاد کی ماھیت اور اس کا طریق تحقیق منحصر ھے۔ مگر اس بارے میں حکما کے درمیان بڑا اختلاف رائے ھے۔ بعض کے نزدیک اس علم کے ابتدائی اصول صرف چند واقعات ھیں جن کا تعلق انسانی فطرت، انسانی تمدن اور کرہ ارض کی طبعی بناوٹ کے ساتھ ھے۔ اور بعض کے نزدیک علم الاقتصاد کے ماھر کا یہ فرض منصبی ھے کہ انسانی فطرت کے کسی ایسے واقعہ کو نظر انداز نہ کرے جس کا تعلق دولت یا دولت کی تقسیم اور پیدائش کے ساتھ ھو۔ لٰہذا ان حکماء کی رائے میں جوں جوں انسانی فطرت کا علم وسیع ھوتا جاتا ھے توں توں علم الاقتصاد بھی وسعت حاصل کرتا جاتا ھے۔ ایک محقق جو ان حکماء کے طبقہ موخرالذکر میں داخل ھے، کہتا ھے کہ ماھرین علم الاقتصاد کے فرائض مندرجہ ذیل ھیں۔

(۱) ان بڑے بڑے اصولوں کا معلوم کرنا جو حصول دولت پر اثر کرتے ھیں۔

(۲) انسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا جن کا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ھے۔

(۳) پیدائش دولت کے قدرتی اسباب کے بڑے بڑے طبعی خواص معلوم کرنا۔

(۴) دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ھیں جن کا مقصود حصول دولت ھو۔ مثلاً ملکی اور تمدنی رسوم، جدید ضروریات کا پیدا ھونا یا قوانین متعلقہ زمین وغیرہ۔ مگر ھماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ھیں۔ علم الاقتصاد کے لئے ضروری ھے کہ اول چند خاص اصول بطور بنا کے قائم کئے جاویں۔ اور پھر یہ معلوم کیا جائے

کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے ان ابتدائی اصولوں میں عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے علم کی بنیاد انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں، ورنہ ان کو صحیح اور کلی نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بالطبع خودغرض ہے۔ یا اس کی فطرت قدرتاً وصف ایثار سے کلی طور پر معرا ہے۔ اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی ہوں گے غلط سمجھے جائیں گے[20] کیوں کہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم کی نہیں ہے، بلکہ خود غرضی اور ایثار دونوں سے مرکب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط مشاہدے پر مبنی ہوں تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصہ میں ہی ایک حیرت ناک اخلاقی تنزل کرے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خود غرضی اور زر پرستی کی بو آئے گی۔ جو اس کو کسی نہ کسی دن حضیض ذلت میں گرا کر چھوڑے گی۔ لہٰذا بعض مصنفین نے فطرت انسانی اور دیگر حالات طبعیہ کو ملحوظ رکھ کر علم الاقتصاد کے لئے چند ابتدائی مفروضات یا علوم متعارفہ قائم کئے ہیں۔ جن پر تمام استدلالات اقتصادیہ مبنی ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے اصول مندرجہ ذیل ہیں :-

---

[20] یہاں جملہ کی نشست و ترتیب میں معمولی تغیر کرنا پڑا ہے۔ اصل مسودہ میں یہ الفاظ تھے ''تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائیں گے غلط ہونگے''۔ معلوم ہوتا ہے کتابت میں الفاظ الٹ پلٹ گئے تھے۔ اب انہیں درست کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(۱) بالعموم هر انسان کم و بیش دولت کی خواهش رکھتا ہے۔

(۲) سرمایہ دار اور محنتی[21] قدرتاً ان مشاغل کو ترک کر دیتے ہیں، جن میں نفع یا اُجرت کم ہو۔ اور ایسے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جن میں منافع یا اُجرت زیادہ ہو۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ابتدائی اصول اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ملک میں ہر طرح سے امن ہو، غلامی کا دستور نہ ہو اور وہ تمام اسباب معدوم ہوں جو سرمایہ داروں اور محنتیوں کو تجارت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ میں منتقل ہونے سے روکتے ہوں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب سے[22] ایک صدی پہلے ہندوستان میں یہ بات بہت مشکل تھی کہ کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر کاروبار کرے۔

(۳) زمین کمیت یا مقدار میں محدود ہے۔ لیکن کیفیت یا خواص میں بالعموم ایک ملک کی زمین دوسرے ملک کی زمین سے مختلف ہوتی ہے۔

(۴) دنیا کی زمین بالعموم اس قدر زرخیز ہے کہ معمولی علم و ہنر کے کاشتکار کا حاصل محنت اس مقدار سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف اس کے ذاتی گذارے کے لئے کافی ہو۔

---

[21] مصنف محترم نے ''محنتی'' اور ''محنتیوں'' کے الفاظ Labourer اور Labourers کیلئے استعمال کئے ہیں۔ جدید رجحان یہ ہے کہ Labour کیلئے ''محنت'' اور Labourer کیلئے ''مزدور'' اور ''اجیر'' کی اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ ملاحظہ ہو ''فرہنگ اصطلاحات بنکاری'' بنک دولت پاکستان صفحہ ۱۰۰ (مرتب)

[22] یہاں اصل متن میں ''اس'' تھا جس سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ ''کہ اب'' ہونا چاہئے۔ (مرتب)

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ علم الاقتصاد منفرد واقعات کے مطالعہ سے قوانین کلیہ بھی قائم کرتا ہے اور اپنے ابتدائی مسلمہ اصولوں سے نتائج بھی پیدا کرتا ہے۔ جنکی صحت یا عدم صحت واقعات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم کی جاتی ہے۔ یا بالفاظ اصطلاحی یوں کہو کہ یہ علم دیگر علوم کی طرح عمل استقرا[23] اور عمل استخراج[24] دونوں کے استعمال سے مستفید ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام کلیہ قوانین واقعات پر مبنی ہوتے ہیں ۔ اور اس لحاظ سے انکا عمل محدود ہوتا ہے۔ مگر علم الاقتصاد کے قوانین کلیہ خصوصیت کے ساتھ محدود ہیں۔ کیونکہ مختلف ممالک و اقوام کے اقتصادی اور تمدنی حالات و واقعات بعض صورتوں میں کم و بیش مختلف ہیں۔ مثلاً اس علم کے بعض قوانین مغرب کے ممالک کی نسبت تو صحیح ہیں۔ مگر ہندوستان کی صورت میں اختلاف حالات کی وجہ سے صحیح نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض حکماء علم الا قتصاد کو ریاضی اور دیگر علوم کا ہم پایہ[25] تصور نہیں کرتے۔ اور اسکو اقوام اور ممالک کے ساتھ مختص سمجھتے ہیں۔ ایک مصنف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ جسکو اُس نے ''اقتصاد ہندی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن[26] سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریق عمل پر مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے کہ اسکا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لئے خاص خاص قواعد اور طریق عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علم اقتصاد کا یہ کام نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے لئے کوئی خاص طریق عمل پیش کرے یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر

---

[23] عمل استقراء : Inductive Method (مرتب)

[24] عمل استخراج : Deductive Method (مرتب)

[25] یعنی صحت و قطعیت میں یہ علم بھی ریاضی کی مانند ہے (مرتب)

[26] ''علم'' سے مراد Science ہے اور فن سے Art—(مرتب)

نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ھیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں ھے کہ اس کے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ھے۔ جس سے آن کی وسعت زیادہ ھو جائے۔ اور آن کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔

علم الاقتصاد کا تعلق دیگر علوم سے

علم اقتصاد اپنی تحقیق میں دیگر علوم سے بہت مدد لیتا ھے۔ مثلاً علم الابدان سے آسے یہ معلوم ھوتا ھے کہ بقائے زندگی کے لئے ایک معین خوراک کی ضرورت ھے۔ یا انسان کے شہوانی قویٰ آبادی کو زیادہ کرنے کی طرف میلان رکھتے ھیں۔ ان ھر دو مسلمات سے مسئلۂ آجرت و آبادئی انسان کی بحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ھے۔ علیٰ ھذا القیاس علم کیمیا سے آسے یہ معلوم ھوتا ھے کہ زمین کی قابلیت پیداوار[27] کی ایک خاص حد ھے۔ جسکو لگان[28] کی بحث میں ملحوظ رکھنا چاھئے۔ مگر یاد رھے کہ اگرچہ اس علم کے محقق کو دیگر علوم کی تحقیقات سے مدد لینی چاھئے۔ تا ھم یہ بھی لازم ھے کہ وہ علم اقتصاد کی ذاتی حدود کو مد نظر رکھے۔ اور آن بحثوں میں نہ پڑ جائے، جنکا تعلق دولت کی تقسیم و تبادلہ وغیرہ سے نہیں ھے۔

علم الاقتصاد اور علم اخلاق

اگرچہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ھے۔ مگر علم اخلاق کے ساتھ اسکا تعلق بہت گہرا ھے۔ اس علم کی طرح علم اخلاق کا موضوع بھی وھی اشیاء ھیں۔ جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ھیں۔ فرق صرف اس قدر ھے کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ھیں جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ھیں۔ اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ھیں جو انسان کے معمولی

---

[27] قابلیت پیداوار : Productivity (مرتب)

[28] لگان : Rent (مرتب)

مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لئے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہئے ۔ مثلاً خوراک ، لباس ، مکان ، ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں ۔ اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جنکو یہ پورا کرتے ہیں ۔ مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے۔ جب ہم اُن پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں ۔ اس لئے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے کسی قدر مطالعہ علم اخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا ۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی ۔ جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی۔ اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی ۔

علم الاقتصاد کا تعلق علم تمدن سے

علم تمدن وہ علم ہے جو انسانی زندگی کا افضل ترین مقصد اور اس کے حصول کے طریق معلوم کرتا ہے ۔ اس علم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ تمام دیگر علوم اس کی تحقیقات سے متاثر ہوتے ہیں ۔ کیونکہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام علوم کا موضوع ذات انسان ہے ۔ جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے ۔ کسی شے کی حقیقی قدرومنزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے ۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے ۔ دولت ہی کو لے لو ۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہمکو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اسکا کیا فائدہ ؟ لہٰذا علم اقتصاد جس کا موضوع دولت ہے وسیع علم تمدن پر مبنی ہے ۔ جسکا منشاء ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ کرنا ہے ۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے ۔ اور یہ تمام اشیاء دولت صحت اور فرائض کی انجام دہی وغیرہ اس مقصد کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں ۔ چونکہ علم تمدن کا منشاء ہمارے اعلیٰ ترین

مقصد کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے۔ اور ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی حقیقی قدر اس علم کے لحاظ سے فیصلہ پاتی ہے۔ اس واسطے علم اقتصاد اور دیگر انسانی علوم علم تمدن سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک معنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر مبنی ہیں۔

علم اقتصاد کے مختلف حصص

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اسکا طریق تحقیق بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس علم کے چار بڑے حصص بیان کرتے ہیں۔ جو تمام اقتصادی مسائل پر حاوی ہیں۔

(۱) دولت کی پیدائش[29]۔

(۲) دولت کا تبادلہ[30]۔

(۳) دولت کی تقسیم[31]۔

(۴) دولت کا صرف یا استعمال[32]۔

اس کتاب کے آیندہ حصص میں علی الترتیب انکا ذکر ہو گا۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ علم الاقتصاد کے حصص کی مندرجہ بالا تقسیم ہم نے منطقی وضاحت کی غرض سے کی ہے۔ ورنہ جیسا کہ تمہیں آگے چلکر معلوم ہو گا - یہ سب حصص آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اشیاء کے صرف یا استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسی اشیاء ملک میں تیار کی جانی چاہئیں۔ اسی طرح پیدائش دولت کی کیفیت اور کمیت اس کی تقسیم سے متاثر ہوتی ہے۔

---

[29] Production

[30] Exchange

[31] Distribution

[32] Consumption (مرتب)

اور اگر انقسام محنت[۵۵] کا اصول پورے طور پر مروج ہو جائے تو پیدائش دولت سے تبادلہ لازم آتا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس دولت کی تقسیم تبادلے سے متاثر ہوتی ہے۔

---

[۵۵] انقسام محنت Division of labour کا ترجمہ ہے۔ جدید اہل قلم ''تقسیم عمل'' یا ''تقسیم کار'' کی اصطلاحات کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو : جریدہ نمبر ۱ ۔ کراچی یونیورسٹی۔ کراچی۔ صفحہ ۵۵ ۔ (مرتب)

حصه دوئم

پیدائش دولت

★ زمین

★ محنت

★ سرمایه

★ قابلیت

باب اول

زمین

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان دولت پیدا کرتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ انسان کسی شے کا خالق ہے۔ یا اُسے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ دولت پیدا کرنے سے مراد محنت اور سرمائے کی مدد سے اشیاء میں صرف ایک خاص قدر کا پیدا کرنا ہے۔ جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کی گئی ہے۔

(ا) قدر مختص بالمکان[1] یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک مقام سے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے، دوسرے مقامات میں جہاں اسکی ضرورت ہے، منتقل کرنے سے اُس شے میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ مثلاً کشمیر میں برف کی کوئی قدر نہیں لیکن اگر پنجاب میں منتقل کی جاوے تو اُس میں قدر پیدا ہو جائیگی۔

(ب) قدر مختص بالزمان[2] ۔ یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک خاص میعاد تک محفوظ رکھنے سے اس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً سردی میں برف کا ایک ٹکڑا کچھ قدر نہیں رکھتا ۔ لیکن اگر موسم گرما کی آمد تک اسکو کہیں دبا کر محفوظ رکھدیا جاوے تو اس میں ایک خاص قدر کا پیدا ہو جانا ممکن ہے۔

---

[1] Place Utility (مرتب)

[2] Time Utility (مرتب)

(ج) قدر مختص بالهیئته[3] ۔ یعنی وہ قدر جو کسی شے میں ایک خاص ہیئت پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی تلوار جو کسی مشین کی مدد سے تیار کی جائے ۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اصل مطلب شروع کرتے ہیں۔ دولت کی پیدائش کے تین بڑے وسائل ہیں ۔ یعنی زمین ' محنت اور سرمایہ ۔ مگر بعض کی راے میں تنظیم محنت بھی پیدائش دولت کی بڑی مد ہے۔ لہٰذا بعض محققین نے اسکو بھی وسائل پیدائش میں شمار کیا ہے۔ اس باب میں ہم صرف زمین کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں ۔

زمین انسان کے لئے ایک قدرتی عطیہ ہے۔ جسکے استعمال پر نہ صرف اسکی موجودہ زندگی اور آسائش کا انحصار ہے۔ بلکہ اس کی وسعت نسل انسانی کی زیادہ سے زیادہ آبادی اور اسکی مدت بقا کو بھی متعین کرتی ہے ۔ چونکہ زمین کی مختلف قسموں کی قابلیت پیداوار[4] مختلف ہے۔ اسواسطے مختلف مقامات میں انسانی محنت کا معاوضہ بھی مختلف ہے۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ ہر انسانی ضرورت بلا واسطہ یا بالواسطہ اس قدرتی عطیے کے مناسب استعمال سے پوری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دولت کے اس وسیع سرچشمہ کو زیادہ زرخیز کرنے یا اپنی ضرورت کے مطابق اس کی قابلیتوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے نئے نئے وسائل دریافت کرتا ہے۔ پیداوار زمین کی کمی بیشی اس کی زرخیزی اور دیگر مقامی خصوصیات مثلاً آب و ہوا ' پانی کی افراط وغیرہ پر منحصر ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک اہم اور نہایت ضروری قانون کے ساتھ وابستہ ہے ۔ جسکا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

---

[3] Form Utility (مرتب)

[4] Productivity (مرتب)

اس قانون کو علم‌الاقتصاد کی اصطلاح میں قانون تقلیل حاصل[5] کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد مقرر ہے۔ یا یوں کہو کہ پیداوار کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو سرمائے اور محنت کے عوض میں کسی خاص زمین سے حاصل ہو سکتی ہے، ایک خاص معین اندازہ رکھتی ہے ۔ جب کوئی زمین ہمارے سرمائے اور محنت کے عوض میں زیادہ سے زیادہ پیداوار د تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کاشت نقطۂ تقلیل[6] تک پہونچ گئی ہے۔ یعنی اس معین مقدار کے حاصل کر چکنے کے بعد سرمائے اور محنت کے دگنا کر دینے سے یہ ضروری نہیں کہ زمین مذکور کی پیداوار بھی دگنی ہو جائے ۔ بلکہ دگنی پیداوار حاصل کرنے کے لئے دگنے سے زیادہ سرمائے اور محنت کی ضرورت ہو گی ۔ اگر محنتیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو ہر محنتی کا حصہ پیداوار کم ہو جائیگا ۔ اور اس کو کم تر معاوضے پر قناعت کرنی پڑے گی ۔ اسی طرح اگر سرمائے میں اضافہ کر دیا جائے تو پیداوار کی زیادتی اس زیادتی سے کم ہو گی جو کاشت کے نقطۂ تقلیل تک پہنچنے سے پیشتر اس اضافہ سے حاصل ہوتی ۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین پر جسکی وسعت سو ایکڑ ہے اور جسکی سالانہ پیداوار دو ہزار من غلہ ہے ، دس آدمی مشترک طور پر کام کرتے ہیں ۔ اس حساب سے ایک ایکڑ کی پیداوار بیس من ہوئی ۔ اور فی کس دو سو من آئے ۔ لیکن اگر محنتیوں کی مذکورہ جماعت میں دو آدمی اور شامل ہو جائیں ۔ اور فن زراعت کی ترقی سے زمین کی زرخیزی کی کوئی نئی راہ نہ نکل آئے تو کیا اس

---

[5] Law of Diminishing Returns (مرتب)

[6] Optimum Point یعنی وہ نقطہ جس پر عاملین پیداوار کے درمیان بہترین توازن قائم ہو جائے اور جس کے بعد پیداوار میں مزید اضافہ مصارف میں غیر متناسب اضافہ کے بعد ہی ممکن ہو ۔ دوسرے الفاظ میں وہ نقطہ جس کے بعد تقلیل پیداوار کا عمل ہوتا ہے شروع (مرتب)

زمین کی پیداوار مندرجہ بالا حساب سے دو ہزار چار سو من ہو گی۔ یا اس سے کم و بیش ؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے اس امر کا دیکھنا ضروری ہے کہ آیا پہلے دس آدمیوں کی محنت اور سرمائے سے زمین مذکور کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی تھی۔ اگر کاشت اس نقطہ تک نہیں پہنچی تو آیندہ سال کی پیداوار دو ہزار چار سو من سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انقسام محنت کی وجہ سے جس کے فوائد کا ذکر باب چہارم میں آئیگا۔ دس آدمیوں کی نسبت بارہ آدمی زیادہ غلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ چکی ہے۔ تو دو آدمیوں کی زیادتی سے پیداوار دو ہزار چار سو من سے کم ہو جائیگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بارہ آدمیوں میں ہر آدمی کو دو سو من سے کم پر قناعت کرنی پڑیگی۔ اس طرح سرمائے اور محنت کی زیادتی سے پیداوار ہر سال زیادہ ہوتی جائیگی۔ اور حصہ فی کس کم ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت کے نقطہ تقلیل تک پہنچ جانے سے پیداوار پھر کم ہونی شروع ہو جائیگی اور حصہ فی کس پہلے سے بھی کم ہوتا جائیگا۔ یہ کمی اول اول تو بتدریج ہوگی۔ مگر بعد میں اس کی سرعت میں یہاں تک ترقی ہو گی کہ زمین مذکورہ کا قطعہ موجودہ محنتیوں کے گذارے کے لئے بالکل ناکافی ہوگا۔ غالباً اس قانون کے عمل نے آریہ ہندوؤں سے وسط ایشیا کے میدان چھڑوائے اور حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جدا کیا جیسا کہ تورات میں مذکور ہے۔ اگر زمین کی کاشت میں سرمائے اور محنت کے بڑھتے جانے سے بالاخر نقطہ تقلیل تک پہنچ جانے کا میلان نہ ہوتا تو ہر مزارع تھوڑے سے قطعۂ زمین کی کاشت پر قناعت کرتا اور اس پر اپنا سرمایہ اور محنت صرف کر کے بہت سی پیداوار حاصل کر لیا کرتا اور لگان کے ایک بہت بڑے حصے کی ادائیگی سے بچ رہتا جو اب وسیع قطعات کی کاشت سے اس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس قانون کی مزید وضاحت کے لئے ایک محقق سرمائے اور محنت کی زیادتی کو دوا کی خوراک سے تعبیر کرتا ہے اور زمین کو مریض قرار دیتا ہے۔ اگر کسی زمین کے ایک قطعہ پر کچھ سرمایہ اور محنت صرف کی

بائے اور اس کی پیداوار صرف خرچ ھی کے برابر ھو تو اُس مـ قق کی اصطلاح میں ایسی زمین کی نسبت یہ کہا جائیگا کہ وہ کنارہ زراعت[7] پر ھے۔ رفتہ رفتہ زیادہ سرمائے اور محنت کے صرف سے پیداوار زیادہ ھو جائیگی۔ یہاں تک کہ کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ جائیگی اور مزید سرمائے اور محنت سے پیداوار میں کوئی متناسب زیادتی نہ ھوگی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ھے کہ سرمائے اور محنت کا حاصل جو مندرجہ بالا قانون کی تحت میں ھے، پیداوار کی مقدار سے متعین ھوتا ھے۔ جو اس سرمائے اور محنت کے عوض میں دستیاب ھوتی ھے۔ پیداوار مذکور کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کو اس حاصل کی تعیین میں دخل نہیں ھے۔ ھاں جب ھم اس قانون سے نتائج استخراج کریں گے اور بالخصوص اس اثر پر بحث کریں گے جو آبادی کی زیادتی سے وسائل زندگی پر ھوتا ھے۔ اُس وقت قیمت کے تغیرات پر بھی بحث کرنا لازم ھوگا۔ ان تغیرات کو نفس قانون سے واسطہ نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق پیداوار کی قدر سے نہیں ھے، بلکہ اس کی مقدار سے ھے۔

اس قانون کا عمل عام ھے۔ اور یہ ھر ملک کے حالات پر صادق آتا ھے۔ اسکا اثر صرف مزروعہ زمین[8] تک ھی محدود نہیں ھے۔ بلکہ چراگاھوں، جنگلوں اور سمندروں کی پیداوار بھی اس قانون کے احاطہ عمل میں ھے۔ اگرچہ بعض حالات میں کلوں اور دیگر ایجادات کی وجہ سے اسکا اثر چنداں ظاھر نہیں ھوتا۔ مصنوعی اشیاء بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ھیں۔ کیونکہ اُنکا ھیولٰے یا مصالح[9] جس سے وہ تیار ھوتی ھیں زمین یا سمندر ھی سے برآمد ھوتا ھے۔ مگر مصنوعات کی مختلف اقسام پر اس کا اثر اس محنت کی مقدار کے لحاظ سے ھوتا ھے۔ جو اُن کی تیاری میں صرف کی جائے۔ قینچی کو ھی دیکھ لو۔ لوھے کو زمین سے نکالنے کا خرچ اس محنت کے مقابل میں کچھ بھی نہیں جو اسکی تیاری میں صرف کیجاتی ھے۔ یہی وجہ ھے کہ اگر کان کی مشکلات بڑھ جانے کی

---

[7] یعنی Margin of Cultivation ۔ (مرتب)

[8] Cultivated land ۔ (مرتب)

[9] مصنف نے ''مصالح'' کا لفظ خام مال Raw Material کے لیے استعمال کیا ھے۔ (مرتب)

وجہ سے لوہے کی قیمت دوگنی بھی ہو جائے تو قینچیوں کی قیمت پر زیادہ[10] اثر نہوگا۔ کیونکہ ان کی قیمت کے تعین میں اس محنت کو دخل ہے جو ان کی تیاری میں صرف ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو قومیں اس قسم کی دستکاری میں مصروف ہیں جو مصالح پر اپنا عمل کرتی ہیں۔ اُن کو اس قانون سے متاثر ہونیکا اندیشہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کی مصنوعات کی قیمت کم‌وبیش ان کی دستکاری اور محنت سے متعین ہوتی ہے۔ جس میں مصالح کے خرچ پیداوار کو بہت کم دخل ہے۔ مگر جو ملک زیادہ تر مصالح پیدا کرتے ہیں اور مصنوعات کی تیاری سے عاری ہیں، اُن کو اس قانون کے نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ بالخصوص ہندوستان کے لوگوں کو۔ کیونکہ ابھی اس ملک کو صنعتی ملک کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔ اگر اس ملک کے لوگ زیادہ تر صنعت کی طرف توجہ کریں، تو اُن کی مالی حالت روزافزوں ترقی کریگی۔ اور مفلسی کے عذاب اور دیگر مصائب سے نجات ملنے کی صورت نظر آئیگی۔ کیونکہ اور ملکوں کی طرح اس ملک کو مصالح باہر سے منگوانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جب زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ جاتی ہے تو اُسکی قابلیت پیداوار کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ معمولی کاشت ہی اُس کے اندرونی خواص کو زائل کرتی ہے۔ بلکہ بعض چند ایسے قدرتی اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کی ذرخیزی کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عام طبعی کے نتائج کی رو سے کوئی شے عدم محض نہیں ہو سکتی۔ بلکہ صرف اُس کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو اُسکا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عدم محض محال ہے۔ تاہم کوئی مفید شے بدل کر ایسی ہئیت یا صورت اختیار کر سکتی ہے جو انسان کے لئے بالکل کار آمد نہو۔ مثلاً جب کوئی مکان جلکر خاک ہو جاتا ہے تو بالکل معدوم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایک مفید ہئیت سے ایک غیر مفید

---

[10] اصل مسودہ میں لفظ ''کچھ'' استعمال ہوا ہے جو حقیقت کی صحیح عکاسی نہیں کرتا - اس لئے ''کچھ'' کی جگہ ''زیادہ'' کر دیا گیا ہے تاکہ مفہوم زیادہ بہتر طریقہ پر واضح ہو جائے - (مرتب)

ھئیت اختیار کر لیتا ھے۔ اسی طرح زمین کے مفید اندرونی خواص انسان کے معمولی کاشت یا دیگر مضرت رسان قدرتی اسباب سے حقیقی طور پر فنا نہیں ھو جاتے ۔ بلکہ ایسی صورت اختیار کر لیتے ھیں جو ھماری ضروریات کے لحاظ سے غیر مفید ھوتی ھے۔

زمین کے اس خاصے کی بنا' پر بعض لوگ کہتے ھیں کہ ھندوستان چونکہ صنعتی ملک نہیں ھے' اسواسطے یہ دیگر ممالک کے لئے ایک طرح کا ذخیرہ بن گیا ھے' جہاں سے وہ اپنے صنعتی کارخانوں کے لئے مصالح حاصل کرتے ھیں ۔ اور پھر اُس مصالح کو اپنی دستکاری کے عمل سے نئی نئی مصنوعات کی صورت میں تبدیل کر کے دیگر ممالک اور ھندوستان میں بھیج کر بے انتہا فائدہ اُٹھاتے ھیں ۔ ھمارے ملک میں چونکہ قانون تقابل حاصل کے عمل کو روکنے کے اسباب بہت قلیل ھیں ۔ لہٰذا جو اشیا' ھندوستان میں دیگر ممالک سے آتی ھیں اُن پر قانوناً بہت سا محصول لگنا چاھئے ۔ جس کا فائدہ یہ ھوگا کہ دیگر ممالک کے تاجر اپنی صنعتی اشیا' اس ملک میں نہ بیچ سکینگے۔ اگر بیچینگے تو اُن کو کچھ فائدہ کی توقع نہ ھوگی ۔ کیونکہ زیادہ محصول کی وجہ سے اُن اشیا' کی قیمت گراں ھو جائیگی ۔ اور یہاں کے لوگ اُن کو خریدنے سے باز رھینگے ۔ اس طرح ھمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خود اپنا محتاج ھونا پڑے گا ۔ اور ھماری صنعت کو ترقی ھو گی ۔ اس طریق عمل کو ''حفاظت تجارت'' یا ''تامین تجارت،، [11] کے نام سے موسوم کرتے ھیں ۔ اور اسکا مقصد یہ ھے کہ تمام ممالک باھمی ایک دوسرے کے دست نگر نہ ھوں ۔ بلکہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے اپنے ملک کے پیدا کردہ مصالح سے خود تیار کریں ۔ اس دلیل سے یہ نہ سمجھ لینا چاھئے کہ مندرجہ بالا طریق عمل کا مقصد قوموں کے باھمی تعلقات کو قطع کرنا ھے ۔ یہ نتیجہ صحیح نہیں ھے۔ کیونکہ تامین تجارت کے موٴیدوں کا مقصد ھر ملک کے لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنا ھے' نہ کہ اُن کے باھمی تعلقات کو زائل کرنا ۔ جو شے کسی ملک میں سرے سے پیدا ھی نہیں ھوتی وہ بمجبوری دیگر ممالک سے حاصل کی جائے گی اور

---

[11] Protection (مرتب)

اس طرح تجارتی تعلقات بدستور قائم رهینگے - بعض لوگ یه کهتے هیں که مصالح پیدا کرنے والوں اور صنعتی اشیاء کے تیار کرنے والوں کو باهمی خرید و فروخت کرنے میں پوری آزادی حاصل هے - اسواسطے کسی قسم کا محصول[12] لگانا گویا انسان کی آزادی پر حمله کرنا هے - مگر ان کو یه معلوم نهیں که بسا اوقات کسی خاص فرد کا فائده عام افراد قوم کے فوائد سے متناقض هوتا هے - تا هم مذکوره بالا دلیل میں دو امور نظر انداز کئے گئے هیں، جن پر غور کرنا نهایت ضروری هے -

(۱) اول تو یه که نظام قدرت خود بخود اس کمی کو پورا کرتا هے جو زمین کی قابلیت پیداوار کے رفته رفته کم هوتے جانے سے لاحق هوتی هے - مثلاً بڑی بڑی چٹانوں کا تحلیل هو کر وسیع قطعات زمین کی صورت میں متبدل هوتے جانا -

(۲) دوئم زمین کے انسانی استعمال میں اس کے کچھ نه کچھ حصے کا ضائع هونا ضروری هے - بلکه بڑے بڑے تجارتی قصبوں کی تعمیر سے بھی یه بات رک نهیں سکتی - اور کچھ نهیں تو ایسے قصبوں میں کچھ حصه زمین ان نهروں کی تیاری هی میں صرف کرنا پڑے گا جن کی وساطت سے کوڑا کرکٹ وغیره سمندر میں پھینکا جاتا هے -

قصه کوتاه یه بحث بڑی دل چسپ هے اور اس کے نتائج مختلف ممالک کے حالات پر منحصر هیں - هم اس پر زیاده خامه فرسائی نهیں کرنا چاهتے - بلکه اس کا فیصله ناظرین کی رائے پر چھوڑتے هیں -

---

[12] Tax (مرتب)

باب دوم

محنت

دولت کی پیدائش کا دوسرا وسیلہ محنت ہے۔ جس سے مراد وہ جسمانی یا غیر جسمانی (دماغی) سعی ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لئے کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس خوشی یا لذت کے جو اس سعی کے دوران میں حاصل ہو۔ قدرت مصالح یا ہیولیٰ مہیا کرتی ہے۔ مگر محنت اس کے مختلف اقسام پر اپنا عمل کرنے سے یا ان کو مطلوبہ ہیئت میں تبدیل کرنے سے اس ہیولیٰ کو انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اس قمیص کو ہی لو جو تم پہنتے ہو۔ اس کو موجودہ مفید صورت میں لانے کے لئے محنت کے مختلف اعمال کا کس قدر طویل سلسلہ درکار ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس مصنفین اور علماء کی تصانیف جن کا منشا قوم کی اصلاح کرنا یا علوم کی اشاعت وغیرہ ہو، خالص دماغی محنت کی مثالیں ہیں۔

تہذیب و تمدن کے اقل درجہ کی حالت میں انسان کی ضروریات قدرت کی فیاضی سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ محنت کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اور جب تک یہ حالت قائم رہتی ہے۔ اشیاء میں وہ خاصیت بھی پیدا نہیں ہوتی جس کو قدر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح خود رو پھلوں پر یا شکار پر گذران کرتا ہے۔ اس حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کم ہو، قحطوں کا تواتر ہو، اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے قبائل انسانی میں باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ قائم رہے۔ مگر جب انسان اس وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے حالت شبانی تک پہنچتا ہے۔ تو اقتصادی

معنوں میں محنت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حالت میں بنی آدم قدرت کی فیاضی کے بھروسے ہی نہیں رہتے ۔ بلکہ مختلف جنگلی حیوانوں کو اپنے قبضے میں لاتے ہیں ۔ پانی کے غیر مستقل ذخیرے کے لئے نہریں کھودتے ہیں ۔ بلکہ آیندہ خشک سالی کی فکر سے خورد و نوش کا سامان جمع کرنا اور اپنے حیوانوں کی حفاظت کرنا بھی سیکھتے ہیں ۔ غرض کہ محنت کی مندرجہ بالاصورتوں کی وساطت سے وہ تمام اشیاء دولت بن جاتی ہیں۔ جو انسان کی وحشیانہ حالت میں اس خاصیت سے معرا تھیں۔ تمدن کی اس حالت میں آبادی دن بدن زیادہ ہوتی ہے' اور خورد و نوش کا سامان صرف کثیر ہی نہیں ہوتا بلکہ بیرونی خطرات سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی ذاتی محنت سے قحطوں کا تواتر رک جاتا ہے۔ اور ان کے گزارے کی سبیل یقینی ہو جاتی ہے۔ آخر کار یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے اور انسان ترقی کر کے اس حالت تک پہنچتا ہے جس کو حالت زراعتی کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ خانہ بدوشی چھوٹ جاتی ہے' آبادی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور محنت کا ہاتھ زمین کے مخفی خزانوں کو غلہ اور دیگر اجناس کی صورت میں نکالنا شروع کرتا ہے۔

اوپر کی سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ پیدائش دولت کے لئے محنت لازم ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر محنت دولت آفریں[1] نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کی دو بڑی اصناف قرار دی گئی ہیں ۔ یعنی

(۱) محنت بار آور ۔ اور

(۲) محنت غیر بار آور ۔

مقدم الذکر سے مراد وہ محنت ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرتی رہے۔ اور آخرالذکر سے مراد اس محنت کی ہے جو مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہ کر سکے ۔ مثلاً مفید اور ضروری اشیاء تیار کرنے والے معماروں' آہنگروں یا سپاہیوں اور استادوں کی محنت بار آور ہے۔ برخلاف اسکے آتشبازی بنانے والے کی محنت غیربارآور ہے۔ کیونکہ آتشبازی کا دستکار بجائے اس کے کہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرے۔

---

[1] Productive (مرتب)

قومی دولت کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کسی جگہ صرف دو آدمی آباد ہیں۔ ایک کے پاس دس روپے ہیں اور دوسرے کے پاس پانچ ۔ یعنی اُن کا کل سرمایہ پندرہ روپیہ ہے۔ فرض کرو کہ جس شخص کے پاس پانچ روپے ہیں۔ وہ اپنا سرمایہ آتشبازی کی تیاری میں صرف کرتا ہے۔ اور شے مذکور کے تیار ہونے پر اُسے اپنے تماشہ پسند ساتھی کے پاس لے جاتا ہے ۔ جو آتشبازی کو دس روپیہ پر خرید لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونو کا سرمایہ جو پہلے پندرہ روپیہ تھا ۔ اب صرف دس روپیہ رہ گیا ہے ۔ جو آتشباز کے قبضہ میں ہے۔ ۔ کیونکہ آتشبازی اپنے مالک کو ایک عارضی خوشی دے کر تھوڑی دیر کے بعد بالکل معدوم ہوجائیگی ۔ لہٰذا تمام غیربار آور محنت جو اسباب تن آسانی پر صرف ہوتی ہے۔ اگرچہ بادی النظرمیں سرمایہ داروں کو محنت بارآور کے مانند منافع خیز معلوم ہوتی ہے (جیسا کہ مثال بالا میں ہمارے آتشباز کو اپنی تجارت سے پانچ روپیہ منافع معلوم ہوتا ہے) تاہم انجام کار قومی دولت کی مقدار کو کم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ محنت اور سرمایہ جو اس پر صرف ہوتا ہے۔ گویا ایسی اشیاء کی تیاری میں صرف ہوتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد قدرسے معرا ہو کر بالکل معدوم ہو جاتی ہیں ۔ اور اس وجہ سے مسلسل طور پر مزید دولت کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتیں ۔ اگر غورسے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بخیلوں اور عشرت پسندوں کا وجود قومی دولت کیلئے یکساں مضرت رساں ہے۔ بخیل بھی عشرت پسندوں کی طرح دولت کو ایک طرح سے فناھی کرتا ہے۔ کیونکہ جو دولت صندوق میں بند رہے، اور مزید دولت کے پیدا کرنے میں صرف نہ ہو اُسکا عدم اور وجود برابر ہے ۔ غرضیکہ محنت کا بار آور یا غیر بار آور ہونا اور سرمایہ کا بار آور یا غیر بار آور طور پر استعمال ہونا مزید دولت پیدا کر سکنے یا نہ کر سکنے کی قابلیت پر منحصر ہے ۔ معلم کی محنت بار آور ہے کیونکہ وہ اوروں کو اس قابل بناتا ہے کہ مزید دولت پیدا کریں ۔ علیٰ ھذا القیاس سپاھی کی محنت بھی بالواسطہ بار آور ہے، کیونکہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہے ۔ جو مزید دولت کے پیدا ہونے کی ایک ضروری شرط ہے ۔ اسی طرح دیگر دستکاروں یعنی معماروں، آھنگروں وغیرہ کی محنت بھی بشرطیکہ اسباب تن آسانی پر صرف نہ ہو بار آور ہے ۔ کیونکہ اُن کی محنت سے ایسی اشیا تیار

ہوتی ہیں ۔ جن سے سلسلہ وار مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ بر خلاف گوٹا بنانے والے کی محنت کے ، کہ اس کا نتیجہ ایک ایسی شے ہے جو خریدنے والے کو ایک عارضی خوشی یا آسائش تو دیتی ہے ، لیکن کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر دولت کی آیندہ پیدائش کے سلسلہ کو یک قلم منقطع کر دیتی ہے ۔ مندرجہ بالا امتیاز کی بنا اس امر پر ہے کہ ہر ملک میں بعض دستکار اور سرمایہ دار تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی محنت اور سرمائے کو ضروریات زندگی کے پیدا کرنے میں صرف کرتے ہیں ۔ اور بعض صرف اسباب عشرت و تن آسانی ہی کو پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات زندگی، اس کے خیالات اور قویٰ میں ایک قسم کا تغیر آتا رہتا ہے ۔ جس سے یہ امکان ہو جاتا ہے کہ جو چیز سو سال پہلے اسباب تن آسانی میں سے تصور کی جاتی تھی اب اخلاقی حالات کی وجہ سے ضروریات زندگی میں شمار کی جائے ۔ لہذا تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج میں ضروریات زندگی اور اسباب تن آسانی یا با لفاظ دیگر یوں کہو کہ محنت بار آور اور غیر بار آور میں تمیز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس ضمن میں یہ بیان کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا توضیح پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں ۔

(۱) فرض کرو کہ ایک استاد بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے ۔ جن میں سے آخر کار دس طلباء معزز عہدوں پر ممتاز ہوئے ۔ مگر باقیوں نے مرفہ الحال ہونے کی وجہ سے کوئی ملازمت یا تجارت وغیرہ نہ کی ۔ ظاہر ہے کہ محنت بار آور کی تعریف کی رو سے استاد کی محنت کا وہ حصہ جو پہلے دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے ، بار آور ہے ۔ کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہو رہی ہے ۔ لیکن وہ حصہ جو باقی دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے ، غیر بار آور ہے ۔ کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہیں ہوتی ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کی محنت ایک حالت میں بار آور اور دوسری حالت میں غیر بار آور ہو ؟ اس اعتراض کا جواب

یہ ہے کہ علم اقتصاد واقعات کے اسباب و علل معلوم کرتا ہے۔ اور اس بات پر بحث کرتا ہے کہ اگر بعض مانع اسباب نہ پیش آئیں تو فلاں واقعہ اس طرح پر ظہور پذیر ہو گا۔ استاد کی محنت دونو صورتوں میں بار آور ہونے کا میلان رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ دوسری صورت میں طلباء کی بے پروائی یا دیگر موانع پیش آ گئے ہیں، اس واسطے غیر بار آور ہو گئی ہے۔

(۲) تم شاید یہ کہو گے کہ اگر کسی شے کے بار آور استعمال سے یہی مراد ہے کہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہوتی جائے تو جو روپیہ ہم لنگڑوں، اپاہجوں اور معذوروں کو بطور خیرات کے دیتے ہیں۔ وہ بھی غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے کوئی مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ بے شک یہ خیال صحیح ہے۔ اور اسی خیال سے ایک مشہور انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ علم الاقتصاد کے اصول اور نتائج انسان کے ذاتی تاثرات کے صریح مخالف ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اگر اس علم کے اصول کی رو سے خیرات کا روپیہ غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ خیرات دینی ہی نہیں چاہئے۔ علم الاقتصاد واقعات پر بحث کرتا ہے، نہ کہ فرائض انسان پر۔ نظری طور پر کسی امر کا صحیح ہونا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ وہ امر اس وجہ سے ہمارے فرائض سے ہی خارج ہے۔ فرائض انسان کی تعیین علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔ بلکہ انکا فیصلہ علم اخلاق کے اصول پر ہوتا ہے۔ جو بہ حیثیت ایک علم ہونے کے علم الاقتصاد سے الگ ہے۔ بلکہ اگر تم غور کر کے دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ نظام تمدن کے بقاء اور اس کے استحکام کے لئے یہ ضروری ہے کہ قومی دولت کا کچھ حصہ فنا بھی ہوتا رہے۔

اس امتیاز کا اصلی مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی ملک میں محنت کی پیداوار کا کم و بیش ہونا مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے ' خواہ وہ ملک حالت شبانی میں ، خواہ زراعتی حالت میں ، خواہ تہذیب و تمدن کے اس درجہ پر ہو جبکہ صنعت و تجارت انتہاے عروج پر ہوتی ہیں :-

(۱) دستکاروں یا محنتیوں کی کارکردگی[2] ۔

(۲) انقسام محنت[3] یا محنت کے مختلف اعمال اور حصص کا مختلف افراد پر تقسیم کرنا ۔ اور اس طریق سے آن کی تخصیص و تنظیم کرنی ۔

محنت کی کارکردگی

محنتی کی کارکردگی کئی اسباب پر منحصر ہے۔

(اول) اس کی موروثی ہمت یا قوی جو فطرت نے آسے عطا کئے ہوں ۔ قدرت کا عطیہ مختلف اقوام کی حالت میں مختلف ہے۔ بعض قومیں قدرتاً قوی اور مضبوط ہوتی ہیں ۔ بعض قدرتاً دبلی پتلی اور مقابلۃً ضعیف ۔ یہی حال افراد کا ہے۔ مگر اس اختلاف کی علت پر بحث کرنا علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔

(دوم) محنتی کی غذا کی کیفیت اور کمیت ۔

(سوم) محنتی کا سامان حفظ صحت ۔ صاف اور ہوا دار مکانوں میں رہنے سے اس کی صحت پر ایک نمایاں اثر ہوگا ۔ جس سے اس کی ہنر مندی ترقی کریگی ۔

(چہارم) محنتی کی فطرتی ذہانت ۔ ذہین محنتی بہ نسبت غبی محنتی کے کئی وجوہ سے زیادہ اچھا کارکن ہوتا ہے۔

---

[2] Efficiency of Labour (مرتب)

[3] Division of Labour (مرتب)

(۱) تو اسے اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کی شاگردی کی مدت طویل ہو۔

(۲) اس پر نگرانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

(۳) وہ اشیا کی تیاری میں کم نقصان کرتا ہے۔

(۴) وہ کل کا استعمال جلد سیکھ جاتا ہے۔

(۵) زندگی کی دوڑ میں بڑھنے کی آرزو، جو سچی خودداری اور غیرت سے پیدا ہوتی ہے اور اس امر کا یقین کہ پیداوار محنت کی افزائش کے ساتھ ساتھ اس کا حصہ بھی بڑھتا جائیگا۔

مندرجہ بالا اسباب میں سے پہلے تین اسباب طبعی ہیں۔ چوتھا عقلی اور پانچواں اخلاقی ہے۔ تم کو معلوم ہے غلاموں کی محنت آزاد محنتیوں کی محنت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ غلاموں کی محنت کارکردگی کی وقعت سے کیوں معرا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ آزاد محنتیوں کی طرح اسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور اپنے ہمراہیوں پر فوقیت لے جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ تازیانہ کا خوف ان قویٰ کو حرکت میں نہیں لا سکتا۔ جن کی تحریک صرف تمنائے دولت اور خود داری کی خلش سے ہوتی ہے۔ آزاد محنتیوں کی صورت میں بھی اجرت کا قطعی اور یقینی ہونا ان کے لئے انتہا درجہ کا قوی محرک ہوتا ہے۔ اور اگر کسی مالک کا نہیں بلکہ اپنا کام کر رہے ہوں، تو اپنی محنت کی کارکردگی کے زیادہ کرنے میں اور بھی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی محنت کی پیداوار کا پورا مالک تصور کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ''حق ملکیت ایک اکسیر ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتا ہے۔'' یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض ممالک میں قانون ہی کچھ اس ڈھب کے وضع کئے جاتے ہیں کہ قوم کے دستکار ان کے اثر سے دن بدن سست ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات یہ قانون ان کو اپنی محنت کا پورا فائدہ اٹھانے سے روکتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ہے ملک سکاٹلینڈ میں

قوانین متعلقه مزارعین اس طرح سے وضع کئے گئے تھے کہ ان بیچاروں کی جانکاھی کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق تھی - یہی وجہ تھی کہ آن لوگوں کے مزاج میں دن بدن کاھلی ترقی کرتی گئی - مگر جب اس قسم کے بیہودہ قوانین منسوخ کر دئے گئے تو انہوں نے اپنی جبلی چستی اور استقلال کو پھر حاصل کر لیا - پس یہ تمام اسباب ھیں جو محنت کی کارکردگی میں اختلاف پیدا کرتے ھیں -

انقسام محنت

کسی قوم کی قوت محنت* کا دوسرا جزو انقسام محنت ھے - تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں ھر انسان اپنی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے سارا کام خود کرتا ھے - اپنی جھونپڑی کا معمار بھی آپ ھی ھوتا ھے' اور اپنے شکار کے لئے تیر و کمان اور دیگر اوزار بھی آپ ھی تیار کر لیتا ھے - مگر اس حالت میں بھی کسی نہ کسی حد تک انقسام محنت کا اصول عمل میں ضرور آتا ھے - عورت سوت کاتتی ھے - پہننے کے لئے کپڑے تیار کرتی ھے - کھانا پکاتی ھے - لیکن مرد اور کام کرتا ھے' جن میں قوت اور چستی کی زیادہ ضرورت ھے - رفتہ رفتہ محنت کا انقسام جنسیت کے امتیاز پر مبنی نہیں رھتا - بلکہ ذاتی قابلیت کے اختلاف پر مبنی ھو جاتا ھے - افراد میں سے کوئی لوھار' کوئی زرگر' کوئی بڑھئی بن جاتا ھے - اور اس طرح آخر کار ھر پیشہ کے مختلف حصے مختلف محنتیوں کے ساتھ مختص ھوتے جاتے ھیں - یہاں تک کہ اکثر ممالک میں ذات پیشہ کے لحاظ سے قرار دی جاتی ھے - ھندوستان کو ھی لو - ھمارے ھاں اصول انقسام محنت کا اثر اس درجہ تک ھوا کہ درزی' لوھار بڑھئی وغیرہ ذاتیں قرار پا گئیں - اور اس امتیاز پر اسقدر بے جا زور دیا گیا کہ اس کے مضرت رساں نتائج بالکل نظر انداز کر دئے گئے - اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں یہ امتیاز قوموں کے لئے مفید

---

* کسی قوم کی قوت محنت سے مراد اس قوم کے دستکاروں کی تعداد ، آن کا ھنر اور ان کی ذھانت وغیرہ ھیں -

ہو سکتا ہے ۔ لیکن کسی شے کے ایک خاص صورت میں مفید ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شے ہر حالت میں مفید ہے ۔

انقسام محنت سے دولت کی پیدا وار روز افزوں ترقی کرتی ہے ۔

(۱) اس کی وجہ سے شاگردی کی مدت کم ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ جب محنتی کو کسی پیشے کا صرف ایک خاص حصہ ہی سیکھنا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے سیکھنے کی مدت اس مدت سے بہت کم ہوگی جو اس پیشہ کی تمام شاخوں کے سیکھنے میں صرف ہوتی ۔

(۲) ایک خاص شاخ کی مزاولت سے اس کے ہاتھ کی صفائی بڑھ جائے گی ۔

(۳) جب ایک محنتی کسی پیشے کی ایک خاص شاخ کے لئے مختص ہو جائے گا تو اُس کو اُس پیشے کی دیگر شاخوں سے کوئی سروکار نہ ہو گا ۔ اور عدم انقسام کی صورت میں جو وقت ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف جانے اور پیشے کے مختلف اعمال کی ادل بدل میں صرف ہوتا تھا ۔ انقسام محنت کی صورت میں بچ جائیگا ۔

(۴) چونکہ ہر محنتی کی توجہ پیشے کی کسی خاص شاخ یا عمل پر مبذول رہا کریگی اس واسطے وہ اپنے مقررہ کام کو سہولت، آسانی اور صفائی کے ساتھ سر انجام دینے کی راہیں ایجاد کرنے کی کوشش کریگا ۔ اگر چہ دنیا کی بڑی بڑی ایجادات علمی ترقی کا نتیجہ ہیں، تا ہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا بہت سا حصہ اصول انقسام محنت کے اثر سے ظہور میں آیا ہے ۔

(۵) انقسام محنت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کام محنتیوں کی قابلیت کے مطابق تقسیم ہوگا ۔ لہٰذا بچے اور عورتیں بھی اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ملک کی دستکاری سے بہرہ ور ہوں گی ۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ انقسام محنت کسی ملک کی صنعت کے لئے کہاں تک مفید ہے۔ لیکن اگر اسی اصول کو دنیا کی تمام اقوام و ممالک پر وسعت دی جاوے یا یوں کہو کہ محنت کی مقامی تقسیم کی جاوے تو اس کے فوائد اور بھی نمایاں معلوم ہوں گے۔ ہر ملک وہی شے پیدا کریگا جس کے پیدا کرنے کی قابلیت اسے خصوصیت کے ساتھ حاصل[4] ہے، اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ ملک اس خاص شے کے پیدا کرنے میں کمال حاصل کرتا جائیگا[5]۔

جو لوگ اصول ''تا مین تجارت''[6] کے مخالف ہیں۔ اُن کی بڑی دلیل یہی ہے کہ قوموں کے تجارتی تعلقات پر کسی قسم کی روک پیدا کرنا گویا لوگوں کو اُن بڑے بڑے فوائد سے محروم کرنا ہے جو محنت کی مقامی تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اُسی ملک یا بازار سے خریدے۔ جہاں وہ کم سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

تم جانتے ہو کہ ہر قوم کے تمدنی اور ملکی حالات کم و بیش مختلف ہیں۔ لہٰذا اُن کی دستکاری میں بھی کم و بیش اختلاف ہے۔ کسی کو کسی شے کی تیاری میں کمال حاصل ہے۔ یا ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اور کسی کو کسی اور شے کی تیاری میں۔ اگر اس قدرتی امر کو ملحوظ خاطر رکھ کر دنیا کی محنت کو اس طور پر مرتب و منظم کریں کہ ہر ملک انہیں اشیا' کے پیدا کرنے میں مصروف رہے۔ جن کے تیار کرنے میں اُسے خاص طور پر قابلیت حاصل ہے' یا یوں کہو کہ دستکاری کی مختلف شاخیں ایک نہ ایک قوم یا مقام کے ساتھ

---

[4] یہاں جملہ کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے الفاظ کی ترتیب میں ادنیٰ تغیر کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[5] علم الاقتصاد میں اس نظریہ کو '' نظریہ تقابلی مصارف '' (Theory of Comparative Cost) اور '' اصول علاقائی تخصیص '' (Principle of Regional Specialisation) کہتے ہیں۔ (مرتب)

[6] Protective Trade - (مرتب)

مختص سمجھی جاویں، تو ظاہر ہے کہ اس تنظیم سے بے انتہا فوائد منتج ہوں گے۔ محنت کی کارکردگی پر ایک نمایاں اثر ہو گا۔ بنی نوع انسان ایک بڑے جسم کی طرح ہیں، کہ مختلف ممالک یا اقوام اس کے اعضا ہیں۔ جو اپنے اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی سے ،،بنی آدم اعضاے یک دیگر اند،، کا پورا مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس طرح جسم کی پرورش اور ترتیب کرتے ہیں۔ پس قطع نظر ان فوائد کے جو انقسام محنت سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تنظیم محنت کا اول تو یہ فائدہ ہوگا کہ دستکاری کی مختلف شاخوں کی تقسیم سے مختلف پیشہ وروں کے کام کی خوبی کا مقابلہ ہو سکیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے درمیان ایک قسم کا رشک پیدا ہو جائیگا اور پیشہ ور اس رشک کے جوش میں سعی کریگا کہ اس کا کام خوبی میں اوروں کے کام سے بہتر ہو۔ علاوہ اس کے تنظیم محنت کی وجہ سے مالکوں یا کارخانہ داروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائیگی، جو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر ہمیشہ یہ سوچتے رہیں گے کہ ملک کی دستکاری مفید ترین راہوں میں صرف ہو۔ اگرچہ مالکوں کی ایک علیحدہ جماعت کے قائم ہو جانے سے اول اول کسی قدر نقصان ہوگا۔ کیونکہ دستکار کو اپنے کام میں وہ ذاتی دل چسپی نہ رہیگی۔ تاہم مجموعی طور پر اس جماعت کا اثر مفید ہوگا۔

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ تنظیم محنت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دستکاری کے مختلف مرکزوں کے درمیان پیام رسانی اور ارتباط کے دیگر ذرائع کا پورا انتظام ہو۔ ورنہ بیگانگی اور عدم تعلق سے بعض اوقات خوفناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گا۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ممالک مغربی و شمالی ایک ہیبت ناک قحط کی مصیبت سے پامال ہو رہے تھے۔ بعض اضلاع میں چاول کا نرخ چار روپیہ فی من تھا۔ مگر بعض اضلاع میں دو روپیہ من سے بھی کم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اضلاع کے درمیان تجارتی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے کافی سڑکیں موجود نہ تھیں۔ جنکی وجہ قحط زدہ اضلاع اُن اضلاع کی پیداوار سے فائدہ اُٹھا سکتے جن میں مقابلۃً ارزانی تھی۔ موجودہ حکام ہندوستان کی دور اندیشی سے اب اس ملک کے مختلف حصص میں تجارتی تعلقات

17007

پیدا ہونیکا سامان دن‌بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ آیندہ اس قسم کے درد ناک مصائب کا تواتر نہوگا ۔ اس ضرورت کے لحاظ سے ایک محقق اس بات پر زور دیتا ہے کہ بستیاں آباد کرنے والوں کے قطعات زمین قریب قریب ہونے چاہئیں ورنہ ہر جماعت صرف وہی اشیاء پیدا کریگی جو اُن کی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے کافی ہوگی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کے درمیان تجارتی تعلقات پیدا نہ ہونگے اور اُن کو ان تمام خطرات کا اندیشہ رہے گا جو عدم سلسلۂ آمد و رفت سے پیدا ہوتے ہیں ۔

اب ہم مختصر طور پر گذشتہ دو باتوں کی بحث کا نتیجہ تحریر کرتے ہیں ۔ تاکہ مندرجہ بالا امور وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائیں ۔ باب دوئم میں تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ پیدائش دولت کے قدرتی اسباب ایک بڑے قانون کے تابع ہیں جسکو قانون تقلیل حاصل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ مگر باب سوم میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ یہ واضح کریں کہ تنظیم محنت سے پیدائش دولت انتہا درجہ کی ترقی کرتی ہے ۔ اگر قانون تقلیل حاصل کی رو سے پیداوار دولت میں نقطہ تقلیل تک پہنچکر دن بدن کم ہوتے جانیکا میلان ہے ، تو تنظیم محنت فن زراعت کی ترقی اور اس فن کی دیگر متعلقہ ایجادات اور سرمایہ کا زیادہ دوراندیشی سے استعمال کرنا اسکی افزائش کے اسباب ہیں ۔

انسان کی آبادی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ اسکی ضروریات بھی بڑھتی جاتی ہیں ۔ لہٰذا اگر وہ صرف قدرتی اسباب کی پیدائش کے بھروسہ پر رہتا اور اپنی روز افزوں ضروریات کے پورا کرنے کی نئی نئی راہیں نہ نکالتا ۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اپنی عقل کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا ، تو اس امن و آسائش میں انتہا درجہ کا خلل پیدا ہوتا ۔ بلکہ اس کی نسل کا بقا ہی محال ہو جاتا ۔ پس ظاہر ہے کہ اصول تنظیم محنت اور اصول تقلیل حاصل ایک دوسرے کے حریف ہیں ۔ جن میں ایک قسم کی جنگ چلی جاتی ہے ۔ جس سے پیدائش دولت میں اعتدال قائم رہتا ہے ۔ اور اعتدال ہی ہر شے کی جان ہے ۔

باب سوم

سرمایہ

نوع انسانی کے ابتدائی مراحل تہذیب میں سرمایہ کا وجود مطلق نہ تھا ۔ پیداوار دولت کے صرف دو وسائل تھے ۔ یعنی محنت اور زمین ۔ مگر موجودہ نظام تمدن میں سرمایہ دولت کی پیدائش کے لئے ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے ۔ جیسا کہ محنت اور دیگر قدرتی اسباب ۔ اس لئے دولت کی پیدائش ناممکن ہے، جب تک کہ موجودہ صرف میں سے کچھ حصہ بچا کر مزید دولت کے پیدا کرنے میں استعمال نہ کیا جائے ۔ لہٰذا نظام تمدن کی موجودہ صورت میں کسی ملک کا سرمایہ اس ملک کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی آیندہ پیدائش کے لئے الگ رکھا جائے* ۔ کسی ملک کی دولت کا وہ حصہ جو اسباب تن آسانی پر صرف کیا جاتا ہے یا اسباب تن آسانی کی تیاری میں لگایا جاتا ہے ۔ بادی النظر میں تو سرمایہ دار کو نفع دیتا ہے ۔ لیکن چونکہ انجام کار قومی دولت پر اسکا اثر اچھا نہیں ہوتا ۔ اسواسطے عام اقتصاد کے اصول کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حصہ بطور سرمایہ صرف ہؤا ہے ۔ بلکہ اس کے استعمال کو غیر بار آور ہی کہا جائیگا ۔ بشرطیکہ یقینی اور قطعی طور پر یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اشیاء جو اس حصہ دولت کی وساطت سے تیار ہوئی ہیں یا خریدی جاتی ہیں، واقعی اسباب تن آسانی میں داخل

---

* زمین افتادہ اور قدرتی دیگر اسباب جبکہ سرمائے اور محنت کی وساطت سے ان کی قابلیت افادت معمول سے زیادہ نہ ہوگئی ہو سرمائے میں داخل نہیں ہیں ۔ اس استثناء کی وجہ آگے معلوم ہو گی ۔

ھیں۔ غرض کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ھے ۔ اور سرمایہ دار کے کم خرچ اور کفایت شعار ھونے پر دلالت کرتا ھے۔

بعض مصنفین کہتے ھیں کہ کسی ملک کی آب و ھوا بھی جہاں تک کہ مزید دولت کی پیدا وار میں مدد دیتی ھے، اس ملک کے سرمائے کا حصہ ھے۔ لیکن چونکہ دولت وہ شے ھے جو تبادلے میں کوئی معین قدر رکھتی ھو، اسواسطے کسی ملک کے مفید قدرتی اسباب مثلاً آب و ھوا یا اسکا جغرافی مقام وغیرہ، اس ملک کے سرمائے میں داخل نہیں تصور کئے جا سکتے ۔ اگرچہ یہ پیدائش دولت کے سمد ضرور ھیں۔ سرمائے کی اصلیت مندرجہ ذیل مثال سے واضح ھو سکتی ھے۔ فرض کرو کہ انسانوں کا ایک قبیلہ سمندر کے کنارے پر آباد ھے اور مچھلی پر گذارہ کرتا ھے۔ جب مچھلی کثرت سے پیدا ھوتی ھے تو ان کے دن بھی اچھے گذر جاتے ھیں۔ مگر برعکس حالات میں ان لوگوں کو قحط کی مصیبت کا سامنا ھوتا ھے۔ اب فرض کرو کہ آن میں سے ایک آدمی اپنے ھم جنسوں کی نسبت امیرانہ گزارہ کرنے کی خاطر مچھلی کا ایک ذخیرہ جمع کرتا ھے۔ یہ ذخیرہ دولت تو ضرور ھے۔ مگر اسکا سرمایہ ھونا اس کے استعمال پر منحصر ھے۔ اگر غیر بار آور طور پر استعمال ھو گا تو بطور سرمایہ صرف نہ ھو گا۔ لیکن اگر مزید دولت کی پیدائش میں صرف ھو گا تو سرمایہ کہلائیگا۔ بالفرض قحط کے موسم میں یہ شخص اپنے ذخیرے کو ساتھ لیکر کسی جنگل کی طرف نکل جاتا ھے۔ اور وھاں جا کر فراغت سے ایک کشتی تیار کرتا ھے۔ جس کی وساطت سے سمندر کے دور و دراز حصوں میں اس کی رسائی ھو سکتی ھے۔ جہاں ساحل کی نسبت زیادہ مچھلی مل سکتی ھے ۔ اس صورت میں کشتی مذکور سرمایہ کہلائیگی اور یہ شخص سرمایہ دار ھو گا ۔

اب اس شخص کے لئے تین راھیں کھلی ھیں ۔

(اول) تو یہ کہ اپنی کشتی خود استعمال کرے اور ماھی گیری کی آمدنی سے اپنے ھم جنسوں کی محنت ایک خاص معاوضے کے بدلے خریدے، اور اس طرح آرام میں بسر کرے ۔

(دوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دے دے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر میں بیٹھا رہے ۔

(سوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دےدے اور خود اور کشتیاں تیار کرنے میں مصروف رہے ۔ فرض کرو کہ کشتی بنانے والا تیسری راہ اختیار کرتا ہے۔ اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صنعت کے گاہک بہت ہیں ۔ جوں جوں وہ زیادہ کشتیاں تیار کرے گا ۔ توں توں اس کا ہاتھ بھی صاف ہوتا جائے گا ۔ اور وہ دن بدن اس قابل ہوتا جائے گا کہ اجرت کے معاہدے پر اپنے دیگر ہم جنسوں کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگائے ۔ کیوں کہ خریداروں کی کثرت کی وجہ سے وہ اکیلا اتنی کشتیاں نہیں تیار کر سکے گا ۔ اب اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر اوروں کو بھی کشتیاں بنانے کی تحریک ہو گی - اور کشتی گروں میں ایک قسم کی تجارتی رقابت[1] ہو جائے گی ۔ اور منافع کی شرح کم ہوتی جائے گی ۔ آخر کار یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ کشتیوں کی مزید مانگ نہ رہے گی ۔ اور اس وجہ سے سرمایہ دار کمی منافع کے خیال سے کشتی گری کو چھوڑ کر معماری کے کام پر اپنا سرمایہ صرف کرنے لگیں گے۔ یا قبیلے کی دیگر ضروریات کا سامان مہیا کریں گے ۔ اس طرح جوں جوں قبیلے کی ضروریات بڑھتی جائیں گی یا یوں کہو کہ جوں جوں قبیلہ مذکور تہذیب و تمدن میں ترقی کرتا جائے گا توں توں اس کا سرمایہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا جائے گا ۔

مثال مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ اول اول ذخیرے کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ کیوں کہ کشتی بنانے والے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے ایام کشتی گری کے لئے اپنی خوردونوش کا سامان مہیا کرے۔ اس کے بعد سرمایہ کشتی گری کے اوزاروں کی صورت اور بالاخر اس مصالح کی صورت میں جس سے کشتیاں تیار ہوتی ہیں ' منتقل ہو گیا ۔ غرض کہ

---

[1] Competition (مرتب)

ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کا سرمایہ اس قوم کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ سرمایہ جو مزید دولت کی پیدائش کے ایام میں سرمایہ داروں اور محنتیوں کی خورد و نوش میں صرف ہو۔

(۲) اوزار۔ یعنی مختلف پیشوں کے ہتھیار۔ آلات اور کلیں وغیرہ۔

(۳) مصالح۔ جس میں دولت کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو سامان معاش اور اوزاروں کے علاوہ ہوں۔

مقدم الذکر صورت میں سے سرمایہ دائر[2] کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ایک ہیئت سے منتقل ہو کر دوسری ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً محنتیوں کی اجرت ان کی اشیاء خوردونوش کی چیزیں قوی حیات کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ موخرالذکر دو صورتوں میں اسے سرمایہ قائم[3] کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کیوں کہ سرمایہ مذکور ایک مستقل اور غیر متبدل ہیئت اختیار کر لیتا ہے جس سے رفتہ رفتہ مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ تہذیب و تمدن کی عام حالتوں میں سرمایہ انہی تین صورتوں میں استعمال کیاجاتا ہے۔ لیکن زمانہ حال کے مہذب ممالک میں اشیاء مادیہ کے علاوہ اعتبار[4] اور حقوق مجردہ[5] مثلاً حق نالش وغیرہ بھی سرمایہ کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ زمانہ حال میں ہزارہا سوداگر اپنے ذاتی اعتبار پر تجارتی اشیاء خرید کرتے اور ان کی فروخت سے نفع اٹھاتے ہیں۔ علیٰ ہٰذاالقیاس زمانہ حال کی تجارت کا بہت بڑا حصہ حقوق نالشی اور دیگر حقوق مثلاً حق تصنیف وغیرہ کی خرید و فروخت کے متعلق ہے۔

---

[2] Circulating Capital (مرتب)

[3] Fixed Capital (مرتب)

[4] Credit (مرتب)

[5] Rights (مرتب)

Institute of Islamic Studies LIBRARY New Delhi

دنیا میں بہت سے ملک ہیں جن کو قدرت نے صنعت و حرفت اور دستکاری کے دیگر اقسام کے لئے نہایت موزوں پیدا کیا ہے۔ لیکن سرمائے کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث ان کی تجارت چمک نہیں سکتی۔ ہمارے ہندوستان کو بھی اس مصیبت کا سامنا ہے۔ یہاں کی تجارت بیشتر مغربی سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو اپنے سرمایہ کو ہندوستانی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگا کر نفع عظیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس سے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ غیر ملکی سوداگروں کا ہمارے ملک میں سرمایہ لگانا ہمارے لئے مضر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر سرمایہ ہمارا اپنا ہوتا تو نفع جو اس سے پیدا ہوتا ہے اور جو موجودہ صورت میں غیر ملکی سوداگروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے، ہمارے ملک میں ہی رہتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان مغربی سوداگروں کے سرمائے کی وساطت سے بالخصوص نیل، غلہ، شکر، کافی اور سونے کی پیدائش کے وسائل پہلے کی نسبت بہت ترقی کر گئے ہیں۔ یا یوں کہو کہ ان لوگوں نے اپنی سرگرمی اور ہمت سے ہماری سرزمین کے مخفی خزائن کے دروازے کھول کر ہمارے لئے آئندہ تجارت کی راہیں کھول دی ہیں۔ بشرطیکہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہو۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ سرمایہ کسی ملک کے وسائل پیدائش کی ترقی، دستکاری اور تجارت کی مختلف شاخوں کے قیام کے لئے کہاں تک ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن سے یہ زیادہ ہو سکتا ہے۔

(۱) یہ بیان ہو چکا ہے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے۔ اور سرمایہ دار کی کفایت شعاری پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا تعلیم یا دیگر حالات جو کسی ملک کے لوگوں کو کفایت شعار بنانے کے ممد ہیں، سرمائے کی زیادتی کا پہلا سبب ہیں۔ دولت بچانے کی خواہش لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور شرح سود کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ البتہ جو قومیں سود لینا خلاف مذہب تصور کرتی ہیں، ان پر یہ محرک اثر نہیں کر سکتا۔

(۲) پیداوار دولت کی مقدار کے زیادہ ہونے سے بھی سرمایہ کی مقدار بڑھتی ہے ۔ اگر کسی ملک میں چالیس ہزار من غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں سے دس ہزار من بطور سرمایہ جمع کر لیا جاتا ہے' تو ظاہر ہے کہ ساٹھ ہزار من غلہ پیدا ہونے کی صورت میں زیادہ مقدار بطور سرمایہ جمع ہونی ممکن ہو سکیگی ۔

(۳) تجارت اور تبادلہ سے بھی سرمائے کی مقدار بڑھتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں پیداوار دولت کی مقدار بڑھتی ہے۔ جس سے (دیکھو مسئلہ نمبر ۲) سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہوتی ہے۔

باب چہارم

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے[1] اس قوم کی زمین، محنت اور سرمائے کے حسن استعمال اور آن کے مفید طریقوں میں صرف ہونے پر انحصار رکھتی ہے[2]۔ خواہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو،[3] خواہ پہنچ گئی ہو۔ محنتی کی ہنر مندی، ذہانت، فن زراعت کی ترقی، تنظیم محنت، سرمائے کو زیادہ دور اندیشی سے نئی نئی مفید صورتوں میں صرف کرنے اور اسی قسم کے دیگر اسباب سے دولت کی پیداوار انتہا درجے کی ترقی کرتی ہے۔ یہاں ایک بڑا ضروری اور اہم اقتصادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پیداوار دولت زمین، محنت اور سرمائے کی قوت پیداوار سے متعین ہوتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ کوئی قوم اس قدر دولت پیدا نہیں کر سکتی جو اس کے وسائل پیدائش کے مطابق ہو؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ وسائل

---

[1] جدید اہل قلم اس باب کو ''تنظیم'' کے عنوان سے مرتب کرتے ہیں اور تنظیم کو چوتھا عامل پیداوار متصور کرتے ہیں۔ (مرتب)

[2] اس جملہ میں الفاظ کی ترتیب میں ادنیٰ تغیر کیا گیا ہے (مرتب)

[3] ایضاً۔

پیدائش میں خواہ کسی قدر قوت ہو دولت کی پیداوار اس قوت کے لحاظ سے کم رہتی ہے ۔ یعنی اس قدر پیدا نہیں ہوتی جس قدر کہ ہونی چاہئے ۔ اس اختلاف کا باعث کیا ہے ؟

اس سوال کا جواب علم الاقتصاد کے تمام حصص کے مطالعہ کے بغیر محال ہے ۔ دولت کے صرف یا استعمال کے بیان میں تمہیں معلوم ہو گا بعض دفعہ دولت کا استعمال قوم کی قوت سرمایہ اور محنت کو انتہا درجے کا نقصان پہنچا دیتا ہے ۔ اسی طرح تقسیم دولت کے بیان میں تم معلوم کرو گے ۔ کہ بعض دفعہ دولت اپنے پیدا کنندوں کے درمیان ایسے بے اصول طور پر تقسیم ہوتی ہے کہ بعض افراد کو ایک مستقل نقصان پہنچ جاتا ہے ۔ علیٰ ہذا القیاس تبادلے کے باب میں اس امر کے اسباب واضح ہوں گے کہ بعض دفعہ پیدائش دولت کیوں رک جاتی ہے یا دستکاری کی چلتی گاڑی میں کیوں روڑا اٹک جاتا ہے ۔ جس سے پچھلے سالوں کی پیدا کردہ دولت ان بے کاری کے دنوں میں صرف ہو جاتی ہے ۔ لہٰذا مندرجہ بالا سوال کا شافی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک تم علم الاقتصاد کے تمام حصص کا غور سے مطالعہ نہ کر لو ۔ یہاں ہم صرف اُن اسباب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ، جو پیدائش دولت کے سد راہ ہیں ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس امر کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کی زرخیزی (بشرطیکہ انسان اپنی عقلمندی کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا رہے) دن بدن کمی کی طرف میلان رکھتی ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :—

(۱) محنت اور سرمایہ کسی حد تک ناقابل انتقال ہیں ۔ تمام مہذب قوموں میں محنت اور سرمایہ دونو کچھ اسطرح خاص خاص صورتیں اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر ان کو ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل کرنا چاہیں تو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ۔ مثلاً جس تاجر نے لاکھوں روپیہ کی رقم کلوں پر صرف کر دی اس کے واسطے یہ امر کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کثیر سرمایہ بغیر خرچ اور دیگر نقصان کے کسی اور صورت

میں منتقل کر دے۔ یا جس دستکار نے ایک خاص پیشہ بڑی جانفشانی سے[4] اور روپیہ خرچ کر کے سیکھا ہے۔ اس کے واسطے کس طرح ممکن ہے کہ اس پیشے کو چھوڑ کر کسی اور پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ؟

(۲) محنت اور سرمائے کا ناعاقبت اندیشی سے استعمال کیا جانا۔ اگر ان ہر دو وسائل کو دوراندیشی سے استعمال نہ کیا جائے تو ان کی قوت پیدائش میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کارخانے کے مالک کی وفات پر اس کا جانشین اپنی خامی اور ناتجربہ کاری کے باعث دوراندیشی سے کام نہ لے اور اس طرح اس کی بد انتظامی کی وجہ سے وسائل مذکور کی قوت پیدائش میں ایک معتد بہ کمی پیدا ہو جائے۔ تم کو معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں ضروریات کے تقاضے سے تمام مہذب ملکوں میں محنت اور سرمائے کا انتظام افراد کی ایک خاص جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ جس کو جماعت مالکاں یا کارخانہ داراں کہتے ہیں۔ اس جماعت کا وجود سرمائے اور محنت کے مفید انتظام کے لئے ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسے فوج کے لئے اعلیٰ افسروں کا وجود۔ جس قدر اصول انقسام محنت پر زیادہ عمل ہوتا جاتا ہے اسی قدر مالک یا کارخانہدار[5] کا وجود نہ صرف تنظیم محنت اور دستکاری کو مفید راہوں میں لگانے کے لئے ' بلکہ دستکاروں کے درمیان حسن انتظام قائم رکھنے کے لئے زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے۔ مالک کے اس امر کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ کون سی شے تیار کی جائے گی' اور کس قیمت پر فروخت کی جائے گی ؟ غرض کہ دنیا کی موجودہ دستکاری اس بات کی طرف میلان رکھتی ہے کہ اس کا انتظام دن بدن ایک خاص جماعت افراد کے ہاتھوں میں آتا جائے[6]۔

بعض ماہرین علم الا قتصاد کی رائے ہے کہ پیدائش دولت کے نظام میں مالک یا کارخانہدار کا وجود ضروری نہیں ہے' بلکہ ان حکما' کے خیال میں

---

[4] یہاں کلمہ ''سے'' کا اضافہ کیا گیا ہے (مرتب)

[6] یہاں اصل میں ''کار خاندار'' تھا (مرتب)

[5] معاشیات کی اصطلاح میں انہی لوگوں کو منتظم یا کار جو Entrepreneur کہتے ہیں۔ (مرتب)

اس کی موجودگی دستکاروں اور کارخانہ‌داروں کے درمیان ایک قسم کی بیجا تجارتی رقابت پیدا کر دیتی ہے جس کے نتائج پیدائش دولت کے حق میں مضرت رساں ہوتے ہیں ۔ اس دقت کے رفع کرنے کی کئی راہیں بتائی گئی ہیں ۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک ہی پیشے کے دستکار مشترک سرمائے سے مل کر کام کیا کریں ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی باہمی معاونت کئی حیثیتوں سے مفید ہے ۔ مثلاً اگر یہ معرض عمل میں آ جائے تو ۔

(۱) دولت کی وہ مقدار جو موجودہ اقتصادی حالات میں مالک کی جیب میں جاتی ہے، دستکاروں کے قبضے میں آئے گی ۔

(۲) دستکار ہر طرح سے خود مختار ہو گا ۔ اور دولت کی جو صورت چاہے گا پیدا کرے گا ۔

(۳) موجودہ حالات تمدن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دستکار مالکوں سے زیادہ اجرت لینے پر ضد کرتے ہیں ۔ اور اگر ان کو اجرت کی مطلوبہ مقدار نہ ملے تو کام کاج چھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن اگر اس طریق کو عمل میں لایا جاوے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا ۔ کیوں کہ جس فریق سے ضد پیدا ہو جانے کا امکان ہے وہ فریق ہی نہ رہے گا ۔

(۴) دستکار کو کفایت شعاری کی تحریک ہو گی ۔ اور اپنا کام تن دہی سے کرے گا ۔

یہ طریق معاونت عملاً دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے ۔

(اول) وہ صورت جس میں دستکار متحد ہو کر کسی خاص تجارتی شاخ میں آمدنی پیدا کرنے کی غرض سے کام کریں[7] ۔

---

[7] یہ وہی چیز ہے جسے فرنس کے مفکرین نے Syndicalism اور انگلستان کے اصحاب قلم اور خصوصیت سے پروفیسر جی ۔ ڈی ۔ ایچ ۔ کول نے صنعتی جمہوریت Industrial Democracy کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ (مرتب)

(دوم) وہ صورت جس میں دستکار اپنی حاصل کردہ دولت باحسن وجوہ صرف کر سکیں ۔ مثلاً چند دستکار مل کر کھانے پینے کی چیزوں کی ایک دکان کھولیں اور آپس میں یہ عہد کر لیں کہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں معمولی منافع پر اسی دکان سے خرید کیا کرینگے ۔ اس طریق سے ایک تو یہ فائدہ ہو گا کہ ضرورت کی چیزیں کسی قدر سستی مل جایا کریں گی ۔ اور علاوہ اس کے مصارف دکان وغیرہ نکال کر جو سال بھر کے بعد منافع [8] ہو گا ۔ وہ سب دستکاروں پر ہر ایک کے حصہ کے مطابق تقسیم ہو جایا کرے گا ۔ مقدم الذکر صورت میں کچھ بہت بڑی کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی ، کیونکہ دستکار متحد ہو کر وہ تجارتی قابلیت نہیں دکھاتے جو کارخانہ داروں میں بالخصوص پائی جاتی ہے ۔ اُن میں سے اکثر صرف کل کی طرح کام کرنا جانتے ہیں، اور اس تجارتی مذاق سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جس کے ذریعے سے کارخانہ دار تجارت کے جذر و مد کو ایک نگاہ سے معلوم کر لیتے ہیں ۔ البتہ مؤخر الذکر میں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے ۔ خصوصاً ہندوستان میں جہاں اس قسم کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے ۔

(سوم) اس مختصر سی گریز کے بعد جاننا چاہئے کہ پیدائش دولت کا تیسرا مانع بعض قدرتی حوادث سے دولت کا برباد ہو جانا ہے ۔ مثلاً آندھی کے طوفان سے جہازوں کی تباہی، آتشی زدگی اور ریل کے دیگر حادثات وغیرہ ۔

اس باب کے ضمن میں ایک اور ضروری مسئلے کی تحقیق بھی لازم ہے ۔ تم جانتے ہو کہ مختلف ممالک میں پیدا وار دولت کی مقدار مختلف ہوتی ہے ۔ بلکہ اگر ایک ہی ملک کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ مختلف زمانوں میں اس ملک کی پیداوار دولت کی مقدار مختلف رہی ہے ۔ بسا اوقات دو ملک تہذیب و تمدن کے ایک ہی درجے پر ہوتے ہیں ۔

---

[8] انجمن ہائے امداد باہمی (Co-operative Societies) اس کی مثال ہیں ۔ (مرتب)

اور آن کے دیگر حالات بھی قریباً قریباً یکساں ہوتے ہیں۔ تا ہم مذکورہ بالا اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اس واقعہ پر غور کرنے سے دو ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) وہ کون سے اسباب ہیں جن سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے؟

(۲) یہ اسباب کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں؟

پیدائش دولت ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے بالعموم تین مدارج ہو سکتے ہیں:-

(ا) وہ محنت جو کسی مادی شے پر قبضہ حاصل کرنے میں عارض ہوتی ہے۔ مثلاً جنگل سے درختوں کا کاٹنا۔

(ب) وہ محنت جو آس قدرتی شے میں ایسے تغیرات پیدا کرنے پر صرف ہوتی ہے جو اس کو انسانی استعمال کے قابل کر دیتے ہیں۔ مثلاً لکڑی کی چوکیاں تیار کرنا۔

(ج) وہ محنت جو مصنوعات کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے میں صرف ہوتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں محنت نسبتاً زیادہ مساعد حالات میں صرف کی جائے گی یا جہاں محنتیوں کی تعداد یا ان کی محنت کی کار کردگی زیادہ ہوگی وہاں پیدائش دولت کا عمل نہایت نتیجہ خیز ہو گا۔ مختلف ممالک کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) بعض ممالک میں محنت کے واسطے حالات نسبتاً زیادہ مساعد ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں قدرت نے اپنی فیاضی سے کوئلے کی وسیع کانیں رکھدی ہیں۔ اور کہیں مفید دھاتوں کے بیش بہا خزانے زمین کے اندر پوشیدہ کر دیئے ہیں۔ علٰی ھذا القیاس بعض ممالک میں کئی اشیا قدرتی طور پر[9] پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ دیگر ممالک انہیں اشیا کو محنت شاقہ سے حاصل کرتے

---

[9] یہاں الفاظ ''طور پر'' کا اضافہ کیا گیا ہے (مرتب)

ھیں ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاھئے کہ اس قسم کے فوائد ھمیشہ یکساں نہیں رھتے ۔ مغلوں کے زمانے میں دریاؤں کا ایک فائدہ اور فائدوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مختلف شہروں اور قصبوں میں تجارتی اور دیگر تعلقات کا سلسلہ انہیں کی وساطت سے جاری تھا ۔ ھمارے زمانے میں یہ سب کام ریل گاڑی کی وساطت سے سر انجام پاتے ھیں ۔ مزید براں یہ بھی یاد رکھنا چاھئے کہ قدرت کے مختصر خزائن سے ھم صرف اسی صورت میں مستفید ھو سکتے ھیں جبکہ ھمکو انکا علم ھو ۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیا مادیہ کے مخفی خواص اور زمین کے پوشیدہ اسرار روز بروز زیادہ معلوم ھوتے جاتے ھیں ۔ اور انسان اُن سے مستفید ھو کر بے انتہا فائدہ اُٹھاتا جاتا ھے ۔ جن قوموں کو یہ علم نہیں، ضرور ھے کہ وہ پیدائش دولت میں اُن اقوام سے پیچھے ھوں جن کو ان اسرار کا علم ھے ۔ معدنیات کو ھی لو ۔ جس ملک کے لوگوں کو یہ معلوم ھی نہیں کہ معدنیات کس طرح دریافت ھوا کرتی ھیں ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، خواہ ان کے ملک کی زمین قیمتی دھاتوں کے خزانوں سے معمور ھو ۔

(۲) بعض ممالک میں دستکاروں کی تعداد زیادہ ھوتی ھے جو پیدائش دولت پر ایک نمایاں اثر ڈالتی ھے ۔ ھمارے ھندوستان میں دستکاروں کی تعداد کثیر ھے ۔ صرف سرمائے کی کسر ھے ۔ ورنہ پیدائش دولت میں ھم اور قوموں سے اس قدر پیچھے نہ ھوتے ۔ کمیت کے علاوہ مختلف ممالک کے دستکاروں کی محنت کی کیفیت بھی مختلف ھوتی ھے ۔ بعض ممالک کے دستکاروں کی عادات جبلی طور پر قوانین صحت کے خلاف ھوتی ھیں ۔ کہیں پانی اور صاف ھوا دستیاب نہیں ھو سکتی ۔ کہیں اور اس قسم کے طبعی اسباب ھوتے ھیں جن سے دستکاری کی کیفیت پر اثر پڑتا ھے ۔ علیٰ القیاس جسمانی قوت کے اختلاف کے علاوہ مختلف مقامات کے دستکاروں کی ھنر مندی ، سمجھ اور دور اندیشی میں

بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض اقوام قدرتاً دیگر اقوام کی نسبت زیادہ ذکی اور چست ہوتی ہیں۔ بعض قدرتاً سست اور آرام طلب۔ اس قسم کے نقائص کا دور کرنا ملک کے مصلحوں اور معلموں کا فرض ہے۔

(۳) محنت کے محرکات میں بھی بالعموم اختلاف ہوتا ہے۔ فطرتاً ہر انسان دولت کا خواہشمند ہے، اور یہ فطری خواہش محنت کا سب سے بڑا محرک ہے۔ لیکن بعض اوقات دیگر محرکات زیادہ زبردست ثابت ہوتے ہیں اور دولت کی خواہش کو انسان کی زندگی پر پورا پورا اثر کرنے سے روکتے ہیں۔ بعض مذاہب میں دولت کی تحقیر ایک مسلم اصول ہے، جو ضرور ہے کہ اُن مذاہب کے مخلص پیرؤں پر اپنا اثر کرے۔ بالعموم مشرقی اقوام کے لوگ تقدیر کے اس قدر قائل ہیں کہ کل کی فکر کرنا جانتے ہی نہیں، اور توکل کے بھروسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ دولت کی خواہش ایک خاص حد تک ہی محرک محنت ہو سکتی ہے، کیونکہ محنت سے اصل مدعا یہی ہوتا ہے کہ تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ جب تمام ضروریات پوری ہو گئیں تو پھر یہ محرک اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان کی ضروری حاجات پوری ہو جاتی ہیں، تو قدرتاً جدید ضروریات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مکان کو آراستہ کرنے اور دیگر آسائش کے سامان کی خواہش۔ علم و ادب اور دیگر علمی مشاغل سے لذت اُٹھانے کی خواہش بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ یہ محرکات ثانی ہیں، جو مختلف اقوام کی حالت میں اور تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج میں مختلف طور پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ اسی طرح[10] ذاتی ضروریات کے پورا ہونے

---

[10] جملہ کو مربوط اور مکمل کرنے کے لئے یہاں ''اسی طرح'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (مرتب)

پر قدرتاً ہر انسان کو اولاد کے لئے کچھ نہ کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے جو محنت کا ایک مزید محرک ہے۔

(۴) مختلف ممالک کے دستکاروں کے اخلاقی حالات مختلف ہوتے ہیں۔ دستکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیانت دار ہو۔ کام چور نہ ہو اور اپنی طبیعت کے غیر نافع جذبات پر قدرت رکھتا ہو۔ جس قدر عاقبت اندیشی اور دیانت داری اس میں ہوگی جس قدر اپنے مقررہ فرض کی انجام دہی کا خیال اس میں ہوگا، اسی قدر اس کی محنت قومی دولت کو زیادہ کرے گی۔ سست اور آرام طلب دستکار اپنے ملک اور قوم کے لئے ایک مضرت رساں وجود ہے۔ کیونکہ اس کا وجود قوم کی دولت کو دن بدن گھٹاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا سب سے ضروری فرض یہی ہے کہ عوام میں دیانت داری، چستی، عاقبت اندیشی اور دیگر ضروری اوصاف پیدا ہوں اور ان کے دلوں پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام قوم کا فائدہ بحیثیت مجموعی اور کسی خاص فرد قوم کا فائدہ متغایر چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور جو دستکار اپنے حیوانی جذبات کی پیروی کر کے اپنے جسمانی اور روحانی قویٰ کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ اپنے ملک اور قوم پر بھی ظلم کرتا ہے۔

(۵) مختلف ممالک میں دستکاروں کی محنت کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے اور اکثر ممالک میں اس کارکردگی کو زیادہ کرنے اور سرمائے کے زیادہ دور اندیشی سے استعمال کئے جانے کے وسائل اختیار کئے گئے ہیں۔ کہیں طریق اشتراک مروج ہے، کہیں طریق معاونت (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کہیں دیگر اقسام کے تجارتی اتحاد پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی طریق اشتراک یعنی مشترک سرمائے سے کام

کرنا اب مروج ہوتا جاتا ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریق ان ممالک کے لئے نہایت مفید ہے جہاں مجموعی طور پر سرمائے کی مقدار کم ہو ۔ اگر کوئی شخص سو روپیہ سرمائے کے ساتھ کوئی تجارت شروع کرے تو اس کو کچھ منافع کی توقع نہ ہو گی ۔ لیکن اگر سو سو روپیہ سرمائے والے بیس آدمی مل کر کام شروع کریں تو بہت زیادہ منافع کی امید ہوگی ۔ یہ اسباب اختلاف مختلف ممالک میں حقیقۃً یا تو موجود ہیں اور اپنا عمل کر رہے ہیں ۔ یا حقیقۃً موجود تو ہیں لیکن ان کا اثر دیگر اسباب کے عمل سے زائل ہو رہا ہے ۔

ہم نے اپنے پہلے سوال کا جواب دیدیا ہے ۔ اب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا اسباب اختلاف کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اسباب میں سے بعض مثلاً سبب نمبر ۱ کا عمل کسی قانون کلیہ کے تابع نہیں ہے ۔ تاہم بعض کا عمل قوانین کے تابع ہے ۔ مثلاً دستکاروں کی تعداد اور اس کے متعلقہ اسباب کا عمل قانون کلیہ آبادی کی تحت میں ہے ۔ اور علیٰ ھٰذا القیاس محنت کی کار کردگی وغیرہ کا عمل قانون سرمایہ کے احاطۂ اثر میں داخل ہے ۔ ماہرین علم الاقتصاد نے اس بارے میں تین کلیہ قوانین دریافت کئے ہیں جن کو ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں ۔

قانون آبادی

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کے افراد کے زیادہ ہونے سے اس قوم کے دستکاروں کی تعداد بڑھتی ہے ۔ مگر اس وقت یہ امر محل بحث نہیں ہے ۔ ہم قانون آبادی پر اس تعلق کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں جو افزائش افراد اور پیدا وار دولت کے درمیان ہے ۔ محققین کہتے ہیں کہ یہ قانون تین قضایا پر منقسم ہو سکتا ہے ۔

اول یہ کہ آبادی ہمیشہ بڑھنے کا میلان رکھتی ہے۔ اور اس کی افزائش اس امر کا خیال نہیں کرتی کہ آیا مزید آبادی کے گذارے کے لئے کافی سامان معشیت موجود ہوگا یا نہیں۔ بعض حکماء نے تخمینہ لگایا ہے کہ بڑے بڑے قحط اور وبائیں نہ آئیں تو آبادی تیس سال میں دوگنی ہو جائے گی۔

دوم اگر زمین کے کسی قطعہ میں آبادی اس طرح دوگنی تگنی ہوتی جائے اور دیگر اسباب اس کی افزائش کی سد راہ نہ ہوں (مثلاً وبا، قحط، جنگ اور شادیونکی کمی وغیرہ) تو ایک خاص میعاد کے بعد قطعہ مذکور کی پیدا وار وہاں کے آدمیوں کے لئے مشکل سے کافی ہوگی، اور بالآخر مطلق کفایت نہ کرے گی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ آبادی کی مفروضہ افزائش کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکے گا۔

سوم ہمارا گذشتہ تجربہ جو ہم کو صنعت و حرفت کی ترقی کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوا ہے، اس امر کی تصدیق نہیں کر سکتا کہ فن زراعت کی آیندہ ترقی سے ہم اپنی آبادی کی مفروضہ افزائش کے مطابق خوراک کی زیادہ مقدار پیدا کرسکینگے۔

قضیہ نبر ۲ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل بھی جسکا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں قانون آبادی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور ان دونوں کے اجتماع سے یہ نتیجہ قائم ہوتا ہے کہ آبادی کے ایک خاص حد تک بڑھ جانے کے بعد زرعی دستکاروں کی مزید آبادی سے محنت کی قابلیت پیداوار کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جسقدر آبادی زیادہ ہوگی اور ایک حد معین سے بڑھتی جائیگی (یہ حد معین مختلف ممالک کی صورت میں مختلف ہو سکتی ہے کیونکہ مختلف اقوام و ممالک میں صنعت و حرفت و فن زراعت اور دیگر ایجادات کی ترقی کے مدارج مختلف ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ ایک چھوٹا سا ملک اپنے ایجادات زرعی کے بل پر ۲۰ کروڑ آبادی کا متحمل ہو سکے اور ایک اور ملک جو اس سے وسعت میں بہت زیادہ ہو لیکن ایجادات میں کم ہو اس سے آدھی آبادی کا بھی متحمل نہ

ہو سکے) اسی قدر زمین مزروعہ کی کاشت نقطہ تقلیل تک جلد پہنچے گی جسکا نتیجہ جو کچھ پیداوار دولت پر ہوگا ظاہر ہے۔

محنت کی کارکردگی

(۲) محنت کی کار کردگی کے اختلافات اور ان کے اثر کے متعلق ' کوئی کلیہ قانون وضع نہیں ہو سکتا کیونکہ دستکاروں کے طبعی، عقلی اور اخلاقی اوصاف کے فرق بیان کرنے اور ان کے محرکات محنت کی تشریح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کو تہذیب وتمدن کے خفی در خفی اسباب کا پورا پورا علم ہو' جو موجودہ صورت میں نا ممکن ہے۔ لہٰذا ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف ممالک کے درمیان مختلف افراد کے ذاتی سرمائے کی افزائش جس پر پیدوار دولت کا ایک حدتک انحصار ہے کس قانون کی تحت میں ہے۔ یا با لفاظ دیگر یوں کہو کہ قانون افزائش سرمایہ شخصی کیا ہے؟ اس امر کے متعلق محقق مل[8] ایک قانون وضع کرتا ہے کہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش شرح سود کے ساتھ نسبت مستقیم رکھتی ہے۔ جس ملک میں شرح سود زیادہ ہوگی وہاں کے لوگوں کو روپیہ جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہوگی اور جہاں شرح سود کم ہوگی وہاں جمع کی تحریک مطلق نہ ہوگی ' یا نہایت کم ہوگی۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ مل کا یہ قانون کامل طور پر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جمع کرنے کی تحریک صرف شرح سود کی مقدار سے ہی نہیں ہوتی' بلکہ اس کے اور بھی کئی ایک اسباب ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ شرح سود کے کم ہو جانے سے جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شرح مذکور کی کمی کی صورت میں

---

[8] J. S. Mill (مرتب)

ضروری ہے کہ زیادہ رقم بطور سود لینے کی غرض سے زیادہ سرمایہ دیا جائے جسکا پہلے جمع ہونا لازم ہے۔

(۳) قانون سرمایہ شخصی تو کسی قدر وضاحت سے بیان ہو سکتا ہے۔ لیکن قانون سرمایہ قومی (سرمایہ قومی سے مراد پیدائش دولت کے وہ وسائل ہیں جو کسی قوم کی گذشتہ محنت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پرانے تعمیر شدہ مکانات، سڑکیں، وغیرہ) کا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی فرد واحد کی نسبت تو ہم کسی قدر رائے لگا سکتے ہیں کہ اس کا سرمایہ کس اصول کے مطابق کم و بیش ہوتا ہے مگر کسی قوم کے سرمائے کی نسبت بحیثیت مجموعی اس قسم کا قانون وضع کرنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ قومی کی زیادتی سے محنت کی مانگ یا یوں کہو کہ اجرت کی مقدار بڑھتی ہے اور اس طرح مختلف ممالک کی پیداوار دولت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ سرمایہ مذکور کا اصل اصول کیا ہے۔ اگر کسی طرح سے کوئی اصول معلوم بھی ہو جائے تو اس سے صحیح نتائج مستخرج نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ بسا اوقات اور بالخصوص زمانہ حال میں اکثر قومیں اتنا سرمایہ خود نہیں استعمال کرتیں۔ بلکہ دیگر اقوام کو مستعار دے دیتی ہیں۔ اگرچہ سرمائے کو اس طرح پر مستعار دے دینے سے اُن اقوام کو دنیا کی پیداوار محنت میں زیادہ حصہ ملتا ہے۔ لیکن اس سے اُن قوموں کی ذاتی محنت کی قابلیت پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ان کی خارجی تجارت کے فوائد میں کسی قدر زیادتی ضرور ہوجاتی ہے۔ مزید براں اکثر اوقات بعض ممالک کے ارکان سلطنت جنگ وغیرہ کے اغراض کے لئے قوم سے قرض لیتے ہیں، جس سے قومی سرمائے میں کمی عارض ہوتی ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس رفاہ عام مثلاً تعلیم و حفظان صحت وغیرہ کے کاموں پر جو محنت صرف ہوتی ہے اس سے کسی

خاص فرد کو کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کا فائدہ عام بلا خصوصیت ہوتا ہے۔ نیز وہ محنت جو اکثر افراد حب وطن کے خیال سے نظام سلطنت کی حفاظت اور اس کی اندرونی قوت کو برقرار رکھنے کے لئے کرتے ہیں اکثر مالی فائدہ کی آمیزش سے معرا ہوتی ہے۔ غرض کہ ان وجوہ سے کسی ملک کے سرمایہ قومی کی کمی بیشی کا کوئی وسیع اور کامل اصول قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

حصہ سوئم

تبادلہ دولت

- مسئلہ قدر
- تجارت بین الاقوام
- زر نقد کی ماہیت اور اسکی قدر
- حق الضرب
- زر کاغذی
- اعتبار اور اسکی ماہیت

باب اول

مسئلۂ قدر

بعض مصنفین کہتے ہیں کہ تبادلہ دولت علم الاقتصاد کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ مگر یہ رائے تجارت اور تبادلے میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے منطقی وضاحت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس مضمون کو علم الاقتصاد کا ایک علیحدہ حصہ سمجھا جائے تاکہ مختلف اقتصادی مسائل آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں۔ اس حصے کا مقصد تناسب تبادلہ یا ان شرائط پر بحث کرنا ہے جن کے رو سے اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جو ایک معین قدر رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دو چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے تو ایک شے کی ایک خاص معین مقدار دوسری شے کی ایک خاص معین مقدار کے عوض میں دی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقدار معین کیوں ہوتی ہے۔ کم و بیش کیوں نہیں ہوتی ؟ علم الاقتصاد کے اس حصے کا مقصد اسی سوال کا جواب دینا ہے۔

تبادلہ انقسام محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی ضروریات کی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہوتا تو تبادلے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ لیکن جب ان کے مشاغل میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، یا یوں کہو کہ مختلف انسان یا اقوام دولت کی مختلف صورتوں کے پیدا کرنے میں مصروف ہوتی ہیں، تو تبادلے کا دستور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہو کہ تبادلہ اتحاد کی ایک صورت ہے جو اختلاف

مشاغل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک شخص غلہ پیدا کرتا ہے، دوسرا مکی یا آلو اور تیسرا کپڑا تیار کرتا ہے تو ظاہر ہے، کہ ضرورت ان سب کو باہمی تبادلے پر مجبور کرے گی۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہو گا کہ غلہ کی کس قدر مقدار دس گز کپڑے یا دو من آلو کے عوض میں دی جائے گی؟ جس قدر اصول انقسام محنت کا عمل وسیع ہوتا جائے گا اسی قدر تبادلے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ لیکن چونکہ ایسی صورت میں افراد کو اپنی ضرورت کی اشیاء کا باہمی تبادلہ کرنے میں دقت ہو گی یا کم از کم ان کے وقت کا کچھ حصہ اس تبادلے میں ضائع ہو گا۔ اس واسطے قدرتاً تبادلے کا کام افراد کی ایک خاص جماعت کے زیر اہتمام آتا جائے گا۔ جسکو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اقراد تبادلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کی وساطت سے تجارت کی گاڑی چلتی ہے، اور دور دراز ممالک کے باشندوں کے درمیان رابطہ اتحاد پیدا ہوتا ہے، اور تبادلہ اشیا کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔

غرض ہمارا مقصد اس حصے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ تبادلے میں اشیا کی خاص خاص مقادیر کن اصولوں کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی غلے کی ایک خاص مقدار کے عوض میں چینی چاء کی ایک خاص مقدار یا جاپانی چھاتوں کی ایک خاص تعداد دی جاوے؟ یہ مقدار یا یہ تعداد کم و بیش کیوں نہ ہو؟ مختصراً اشیا میں قوت تبادلہ کن کن شرائط سے پیدا ہوتی ہے؟ اور اس کے اسباب و وجوہ کیا کیا ہیں؟

قدر کی تعریف اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھی جاچکی ہے[1] یعنی قدر قوت تبادلہ کا نام ہے۔ یا اس قدر و قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے اور جس کو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلا لحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کیوں ایک شے اپنے قابض کو یہ قدرت یا قوت دیتی ہے، اور دوسری نہیں دیتی؟ کیوں ایک شے کے قبضے سے اوروں کی پیداوار

---

[1] ملاحظہ ہو حصہ اول باب اول (مرتب)

محنت پر ہفتوں مہینوں بلکہ سالوں تک یہ قدرت حاصل رہتی ہے اور دوسری شے کے قبضے سے یہ قدرت مطلق حاصل نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو نہایت قلیل عرصے کے لئے ؟ یہ سوال علم الاقتصاد کے نہایت ضروری سوالوں میں سے ہے۔ لہٰذا طالب علم کا فرض ہے کہ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے۔

ظاہر ہے کہ تبادلے کے لئے کم از کم دو اشیاء کا ہونا لازم ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی شے کا تبادلہ ہو سکتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اسکا تبادلہ کسی اور شے کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شے کی قدر تبادلے میں اتنی ہے' تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم کسی اور شے یا اشیاء کی قدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں' جن کے عوض میں شے مذکور دی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ دوسری شے جس کے عوض میں کوئی شے دی جاسکے زر نقد ہے' جسکو دنیا کی مہذب اقوام نے اشیاء کی قدر کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ پس کسی شے کی قدر سے حقیقت میں مراد اس کی قیمت سے یا زر نقد کی اس مقدار سے ہے جو اس شے کے عوض میں دی جائے۔ اس مقام پر قدر اور قیمت کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے' لہٰذا ہم اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں - فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس ۴ من غلہ ہے جس کے عوض میں اسے ۲۷ من کوئلہ مل سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ ۴ من غلے کی قدر ۲۷ من کوئلے کی قدر کے برابر ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے مفہوم میں اشیاء کا مقابلہ داخل ہے' اور قدر ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ایک شے کی قدر دو طرح سے کم وبیش ہو سکتی ہے۔ یا تو اس کی ذاتی قدر میں کمی بیشی ہونے سے' یا دیگر اشیاء کی قدر میں تغیر پیدا ہو جانے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں نہیں بڑھ سکتی۔ کیونکہ ایک شے کی قدر کی زیادتی اور دوسری کی قدر کی کمی لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کہنا کہ ایک ہی وقت میں اشیاء کی قدر کم وبیش ہو سکتی ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہدے

کہ چھ اشخاص[2] میں سے ہر ایک اپنے باقی پانچ ہمراہیوں کی نسبت زیادہ تیز رفتار ہے۔ الغرض کسی شے کی قیمت اسکی قدر کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ جب کسی شے کی قدر کا تخمینہ ان قیمتی دھاتوں کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے کیا جائے جو شائستہ اقوام میں بطور معیار قدر مستعمل ہوں، تو کہا جاتا ہے کہ اس شے کی قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ گو تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں کم وبیش نہیں ہو سکتی تاہم نہ اُن کی قیمت کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے۔

مندرجہ توضیح سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ مسئلہ قدر حقیقت میں اُن اسباب کا دریافت کرنا ہے جن پر اشیاء کی قدر ایک معین معیار کے لحاظ سے منحصر ہوتی ہے۔ ان معنوں میں کوئی شے قدر نہیں رکھ سکتی جب تک اس میں دو خواص نہ ہوں۔ اول افادت[3] دوئم دقت حصول[4]۔ افادت سے مراد یہ ہے کہ اس شے میں کسی انسانی ضرورت یا خواہش کو پورا کر سکنے کی خاصیت موجود ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا امتحان ہے کہ جب تک کوئی شے پہلے اس امتحان میں کام یاب نہ ہو لے قدر رکھنے والی اشیاء کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس فہرست میں کوئی خاص درجہ یا مقام حاصل کرنا اس شے کی دقت حصول پر موقوف ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جسقدر کسی شے میں انسانی ضروریات کو پورا کر سکنے کی خاصیت ہوگی اسی قدر اس شے کی قدر بھی زیادہ ہو گی۔ اسی افادت کی کمی بیشی کی وجہ سے اشیاء کی طلب یعنی مانگ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جس قدر کسی شے میں افادت زیادہ ہو گی اسی قدر اسکی مانگ

---

[2] اصل عبارت میں ''شخصوں'' تھا جسے ہم نے ''اشخاص'' سے تبدیل کر دیا ہے۔ (مرتب)

[3] افادت سے مراد Utility ہے۔ جدید اہل قلم اسے ''افادہ'' یا ''افادیت'' کی اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ (مرتب)

[4] ''دقت حصول'' سے مراد ''قلت''، ''کمی''، یا ''کمیابی'' (Scarcity) ہے۔ (مرتب)

بھی زیادہ ہو گی ۔ اور جس قدر افادت کم ہو گی اسی قدر اس کی مانگ بھی کم ہو گی ۔ خریدار ان اشیاء کا معاوضہ زیادہ دینگے جنکی ان کو ضرورت ہے ۔ مگر جن اشیاء کی ان کو ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاوضہ اول تو دینگے ہی نہیں ۔ یا اگر دینگے تو بہت کم دینے پر راضی ہوں گے ۔ بعض محققین علم‌اقتصاد نے انسانی فطرت کے اس میلان کو ظاہر کرنے کے لئے اصطلاح افادت انتہائی[5] استعمال کی ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاح مذکور نہایت مفید ہے کیونکہ اس کے استعمال سے تبادلے کی تحریک اور اس کے فوائد کی توضیح ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم واضح کرنے کی غرض سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں ۔ فرض کرو کہ آٹے کا ایک سیر ایک آدمی کی بقاے حیات کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ایک سیر میں زیادہ افادت ہو گی ۔ لیکن اس شخص کے نزدیک آٹے کے دوسرے اور تیسرے سیر میں وہ افادت نہ ہو گی جو پہلے سیر میں تھی۔ کیونکہ وہ مقدار اس کے بقاے حیات کے لئے لازم تھی ۔ اس مثال میں مقدار تو وہی ایک سیر ہے۔ لیکن ہر سیر کی افادت آٹے کو استعمال کرنے والے کے لحاظ سے مختلف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص آٹے کے تیسرے سیر کو اس قیمت پر خریدنا پسند نہیں کریگا، جس قیمت پر کہ اسنے پہلے سیر کو خریدا تھا ۔ پس کسی کی افادت انتہائی سے مراد اس شے کی آخری یا اختتامی حصے کی افادت ہے جسکو مشتری قیمت کی اس کم سے کم مقدار کے عوض میں خرید کرتا ہے ۔ جو اس شے کا بائع منظور کر سکتا ہے۔ مثال بالا میں آٹے کے تیسرے سیر یعنی اختتامی یا انتہائی حصے کی قیمت اسکی افادت سے متعین ہو گی ۔ چونکہ مثال مذکور میں خریدار کو آٹے کے تیسرے سیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اسواسطے اول تو وہ خریدے گا ہی نہیں۔ اور اگر خریدیگا بھی تو اس بات پر مصر ہو گا کہ قیمت کی کم سے کم مقدار ادا کرے۔ آخر کار قیمت کی اس کمتر مقدار پر سودا ہو گا جسکو بائع شے منظور کر

---

[5] ''افادت انتہائی'' سے مراد ''افادہ مختتم'' ہے ۔ جسے انگریزی میں Marginal Utility کہتے ہیں ۔ (مرتب)

سکتا ہے۔ اس توضیح سے ظاہر ہے کہ خریداروں کے لحاظ سے اشیاء کی معمولی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے۔ بعض محققین کے نزدیک یہی افادت قدر اشیاء کا اصل اصول ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر شے کی قدر اس شے کی افادت پر منحصر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شے میں قدر ہو گی اس میں افادت بھی ضرور ہو گی۔ لیکن بر عکس صحیح نہیں ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر مفید شے کوئی خاص قدر بھی رکھتی ہو۔ ہوا پانی وغیرہ مفید اشیاء ہیں، مگر ان کی قدر کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ قدرت خود بخود بغیر انسانی کوشش کے ان کو کثرت سے مہیا کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی شے بعض اشخاص کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اور بعض کے لئے کچھ فائدہ نہیں رکھتی۔ علیٰ ہٰذاالقیاس بعض اشیاء خاص خاص مقامات میں افادت رکھتی ہیں، بعض میں نہیں۔ مزید برآں بعض اشیاء میں مطلق افادت نہیں ہوتی، لیکن ان کی قدر بڑی ہوتی ہے۔ مثلاً ہیرے، جواہرات، وغیرہ۔ غرض کہ افادت قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس کے لئے ہمیں کوئی اور کلیہ اصول معلوم کرنا چاہئے۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ افادت کے علاوہ قدر کے لئے دقت حصول بھی ضروری ہے۔ یعنی ان کے نزدیک کسی[6] شے کا مفید ہونا اور نیز مشکل سے ہاتھ آنا اُس[7] کی قدر کا باعث ہوتا ہے۔ اس رائے کو صحیح تسلیم کرنے والے دقت حصول کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اشیاء کی رسد محدود ہو۔ مثلاً گذشتہ مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں یا دیگر کم یاب چیزیں۔ کیا اس صورت میں اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہوگی، جو ابتداً ان پر صرف ہوئی تھی؟ نہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان بالعموم اپنی محنت ایسی اشیاء کے معاوضے میں نہیں دیتا جن پر کچھ محنت نہ صرف ہوئی ہو۔ اور نیز بالآخر مجموعی طور پر اشیاء کی قدر قریباً قریباً اس محنت کے مطابق ہو گی جو ان پر ابتدءاً صرف ہوئی تھی۔ تاہم حق یہ ہے کہ کسی شے

---

[6] اصل نسخے میں لفظ ''کسی'' نہیں تھا (مرتب)
[7] اصل نسخے میں یہاں لفظ ''اس'' تھا (مرتب)

کی قدر اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ اس شے کی تیاری میں ابتداً کتنی محنت صرف ہوئی تھی۔ بلکہ یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ شے اب بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شاہ نامہ فردوسی کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا مل جائے تو اس کی قدر اس محنت کا نتیجہ نہ تصور کرنی چاہئے جو ابتداً اس کی تحریر میں صرف ہوئی تھی۔ بلکہ اسکا انحصار اس امر پر ہو گا کہ اکثر لوگوں کو اس نسخہ کی ضرورت ہے اور اب ایسا تیار نہیں ہو سکتا۔ لہذا ابتدائی محنت بھی کسی شے کی قدر کا ملخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ مندرجہ بالا دلیل کے علاوہ اس دعویٰ کے[8] ثبوت میں ذیل کے دلائل بھی دئیے جا سکتے ہیں :-

(ا) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے' تو قدر کی کمی بیشی محنت کی کمی بیشی پر منحصر سمجھنی چاہئے۔ مگر یہ بات صریحاً تجربے کے خلاف ہے۔ جس وسیع زمین پر لاہور جیسا عظیم الشان شہر آباد ہے' اس کی قدر اندازے سے زیادہ ہے۔ لیکن یہ زمین کسی طرح محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔

(ب) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو جن دو چیزوں پر مساوی محنت صرف ہوئی ہے' ان کی قدر بھی مساوی ہونی چاہئے۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ اگر ایک ٹکڑا سونے اور ایک ٹکڑا لوہے کا دونوں مساوی محنت سے حاصل ہوں' تو کیا ان کی قدر بھی مساوی ہو گی ؟ ہرگز نہیں۔

(ج) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے' تو ہر شے کی قدر اس محنت سے متناسب ہو گی' جو اس شے کے حاصل کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کو خوش قسمتی سے زمین کی سطح پر پڑا ہوا سونے کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ ایک اور شخص کو ویسا ہی ٹکڑا ہفتہ بھر زمین کھود کھود کر ملتا ہے۔

---

[8] اصل میں یہاں کلمہ ''کی'' تھا (مرتب)

علیٰ ھذٰالقیاس ایک اور شخص ہے جس کو اس قسم کا ٹکڑا مہینے کی محنت کے بعد ملتا ہے۔ اس اصول کے رو سے چاہئے کہ جس شخص کو ایک مہینے کی محنت کے بعد سونے کا ٹکڑا ملا ہے اس کا سونا اس شخص کے سونے سے بہت زیادہ بیش قیمت ہو جس کو بغیر محنت کے زمین پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔

(د) اگر محنت کو قدر کا باعث سمجھا جائے تو جس شے پر محنت صرف کی گئی ہے چاہئے کہ اس کی قدر دوامی اور مساوی ہو۔ مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شے کی قدر مختلف مقامات میں مختلف ہوتی ہے۔ بلکہ بعض جگہ کئی اشیا' کی قدر کچھ بھی نہیں ہوتی' حالانکہ ان پر محنت بھی صرف کی گئی ہو۔ افریقہ کے وحشیوں کے درمیان ایک سنسکرت پڑھانے والے پنڈت یا عربی کے تعلیم دینے والے مولوی کا علم کیا قدر رکھ سکتا ہے؟ اگر ہندوستان کے مسلمان ترکی ٹوپیاں پہننا یک قلم ترک کر دیں تو اس اصول کے رو سے ضرور ہے کہ ان کی قدر بدستور قائم رہے اگرچہ ان کی مانگ مطلق نہ ہو۔

(ر) اگر محنت کو قدر کا ماخذ سمجھا جائے تو محنت کی قدر کا کیا ماخذ ہوگا؟

(۲) دوسری صورت دقت حصول کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی شے کی تیاری میں محنت اور سرمائے کی ضرورت ہو۔ اس ضمن میں جو اشیاء داخل ہیں ان کی قدر یا قیمت ان اشیاء کے مصارف پیدائش سے متعین ہوگی۔ یہ غلطی بھی اسی غلطی کا ایک نتیجہ ہے کہ اشیاء کی قدر کا ماخذ محنت ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ قدر کا انحصار ابتدائی محنت پر نہیں ہوتا' بلکہ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت میں وہ شے بغیر محنت اور سرمائے کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بعض کوئلے کی کانوں میں اوپر کے تہوں کا کوئلہ نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اور نیچے کی تہوں کا کوئلہ اچھا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں

مٹی اور راکھ وغیرہ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کا کوئلہ نکالنے میں مصارف کی مقدار کم ہوگی اور نیچے کا کوئلہ نکالنے میں چونکہ محنت زیادہ صرف ہوئی ہے، اسواسطے مصارف کی مقدار بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر اشیاء کی قدر مصارف پیدائش پر منحصر ہے تو چاہئے کہ نیچے کے کوئلے کی قیمت اوپر کے کوئلے کی قیمت سے بہت زیادہ ہو۔

(۳) تیسری صورت دقت حصول کی یہ ہے کہ بعض اشیاء اس قسم کی ہوتی ہیں جنکو ایک معین میعاد کے اندر تیار کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ جن لوگوں کو انکی ضرورت ہے وہ اس عرصہ تک انتظار کریں۔ اس صورت میں اشیاء کی قیمت ان مصارف سے متعین ہوتی سمجھی جائیگی جو ان کے از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوتے ہوں۔ مگر یہ بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک نہایت قدیم زمانے کی کل کو ان مصارف سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اس کے نئے سرے سے تیار کرنے میں عاید ہوتے ہیں۔ کل تو ویسی تیار ہو سکتی ہے۔ مگر چونکہ یہ پرانی کل آثار قدیمہ میں سے تصور کیجائیگی، اسواسطے اسکی قدر یا قیمت بہت زیادہ ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ اشیاء کی قدر یا قیمت (کیونکہ قیمت بھی قدر ہی کی ایک صورت ہے) افادت محنت ابتدائی یا آن مصارف پر جو ان کی از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوں، منحصر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تینوں قدر کی عوارضات ضرور ہیں۔ تاہم اسکی ماخذ نہیں قرار دیجاسکتی۔ پھر وہ کونسا کلیہ اصول ہے جس پر اشیاء کی قدر کا دار و مدار ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قدر اشیاء قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے* جس کی توضیح ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

---

* (حاشیہ از مصنف) بعض حکما' ریکارڈو' سمتھ و مل وغیرہ کہتے ہیں کہ بعض اشیا' کی قدر تو ان کی طلب و رسد کی درمیانی نسبت پر انحصار رکھتی ہے مگر بعض کی ان کے مصارف پیدائش پر۔ یہی وجہ ہے

سہولت کے لئے ہم پہلے قانون طلب کا مفہوم واضح کریں گے ۔ بعد میں قانون رسد کا ۔ اور پھر دونوں توضیحات کو یکجا کر کے ایک وسیع قانون قائم کریں گے ۔ طلب سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷

کہ مل کو اشیاء مادیہ کی تقسیم کرنی پڑی اور ہر قسم کے لئے خاص قوانین وضع کرنے پڑے ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ رائے صریحاً غلط ہے ۔ کیونکہ جیسا طالب علم کو آگے چل کر معلوم ہو گا یہ ایک غلط اصول پر مبنی ہے ۔ ''یعنی اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہے جو ابتداً ان کی تیاری میں صرف ہوئی ہو ۔'' یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مختلف مقادیر اقتصادیہ کے لئے مختلف قوانین ہوں ۔ علم الاقتصاد بھی دیگر علوم طبعیہ کی طرح ہے ۔ جس طرح ان علوم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض فطری مظاہر کی توجیہ کے لئے ایک خاص قانون ہو اور بعض کی توجیہ کے لئے کوئی اور مختلف قانون ہو ۔ اسی طرح یہ بات علم الاقتصاد میں بھی محال ہے ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں مقابلہ[9] یا تجارتی رشک کے اثر کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ان کے مصارف پیدائش کے قریب قریب آجائے گی ۔ اور ریکارڈو کا اصول صحیح معلوم ہو گا ۔ لیکن یہ بات ہر حالت میں درست نہیں ہے ۔ بعض دفعہ غلط اصول سے بھی واقعات کی توجیہ ہو جایا کرتی ہے ۔ لیکن اس توجیہ سے اصول کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا صریحاً قوانین منطق کے خلاف ہے ۔ قدیم حکماء کا مذہب تھا کہ اجسام کی حرکت قدرتاً کم ہو جانے کا میلان رکھتی ہے ۔ یہاں تک کہ آخر کار بالکل معدوم ہو جاتی ہے ۔ اس اصول سے کئی فطری واقعات کی توجیہ ہو سکتی تھی ۔ لیکن زمانہ حال کے حکماء نے اس اصول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا ۔ اگرچہ اس اصول کے نتائج کو انہوں نے مان لیا ہے ۔ کیونکہ ان کے نزدیک حرکت اجسام قدرتاً کم ہونے جانے کا میلان نہیں رکھتی ۔ بلکہ ہر صورت میں بعض اسباب (مثلاً ہوا کی روک

---

[9] مراد ہے Competition جس کے لئے اردو میں مروجہ اصطلاح ''مسابقہ'' ہے ۔ (مرتب)

خاص قیمت پر خرید کی جائے ۔ اس تعریف میں ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس مقدار کی قیمت کا ادا کرنے والا حقیقی طور پر اس قیمت کو ادا کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ طلب اور خواہش حصول مرادف نہیں تصور کئے جا سکتے۔ کیونکہ ہر شخص ہر شے کے حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے، اگر چہ اشیا' مذکورہ کے خرید کر سکنے کی قوت اس میں نہ ہو ۔ اس کے علاوہ تعریف مندرجہ بالا میں الفاظ ''خاص قیمت'' بھی ضروری ہیں ۔ کیونکہ قیمت کے تغیر سے شے مطلوب کی مقدار میں بھی تغیر مطلوب ہوگا ۔ قانون طلب کے ذریعہ تغیر قیمت سے وابستہ مقدار مطلوب کے تغیر کی توضیح ہوتی ہے[10] یعنی جب کسی شے کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو (بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے) اس کی مقدار مطلوب بڑھ جاتی ہے اور بر عکس اس کے جب قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو مقدار مطلوب کم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا ہے ''بشرطیکہ زر نقد کی قیمت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے''۔ اس قید کا ہونا ضروری ہے کیونکہ جوں جوں کسی شخص کے وسائل آمدنی ترقی کریں گے یا یوں کہو کہ جس قدر کوئی شخص زیادہ دولت مند ہوتا جائیگا ۔ اسی قدر اس میں اشیا' کو زیادہ قیمت کے عوض میں خرید کر سکنے کی قوت بڑھتی جائے گی - اور جس قدر اس کے وسائل آمدنی کم ہوتے جائینگے یا جوں جوں وہ رقم جو اس کے پاس ہے، کم ہوتی جائے گی ، اسی قدر اس کی قوت خرید بھی کم ہوتی جائیگی ۔ اگر پہلی صورت میں وہ ایک شے کو دس روپیہ کے عوض میں خرید

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸

یا رگڑ وغیرہ) ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس حرکت کو روکتے ہیں ۔ اور آخر کار اس کو معدوم کر دیتے ہیں ۔

[10] یہ پورا جملہ از سر نو ترتیب دیا گیا ہے۔ اصل جملہ یہ تھا ''مقدار مطلوب کے تغیر سے جو تغیر قیمت کے ساتھ وابستہ ہے قانون طلب کی توضیح ہوتی ہے'' ۔ یہ جملہ گنجلک ہونے کے باعث مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر رہا تھا ۔ (مرتب)

کر سکتا تھا تو دوسری صورت میں پانچ روپیہ کو بھی نہ خرید کر سکیگا ۔ اگرچہ ضرورت دونو صورتوں میں ایک سی ہی کیوں نہ ہو ۔ پس اس قانون کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اشیاء کی مقدار مطلوب کمی قیمت سے بڑھتی ہے اور زیادتی قیمت سے کم ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر چھاتوں کی قیمت بڑھ جائے تو بہت سے خریدار جو پہلے چھاتے استعمال کیا کرتے تھے اب ان کا استعمال ترک کر دینگے ۔ اور صرف وہی لوگ اُن کو خرید کرینگے جو زیادہ قیمت کے متحمل ہو سکتے ہیں ۔ لہٰذا چھاتوں کی مقدار مطلوب کم ہو جائیگی ۔ اور اگر قیمت کم ہو جائے تو بہت سے لوگ جو پہلے چھاتوں کو استعمال نہیں کرتے تھے ۔ اب کمی قیمت کی وجہ سے استعمال کرنے لگ جائیں گے ۔ لہٰذا ان کی مقدار مطلوب میں زیادتی ہو جائیگی ۔

علیٰ ہٰذاالقیاس رسد سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت کے عوض میں فروخت کئے جانے کے لئے پیش کی جائے اور قانون رسد کو عام الفاظ میں اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ جس قدر قیمت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر (بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضہ میں ہو مساوی رہے) مقدار اشیاء فروختنی بڑھتے جانے کا میلان رکھتی ہے ۔ جب کسی شے کی قیمت زیادہ ملے گی تو ہر تاجر اُسی شے کی تیاری پر سرمایہ صرف کرے گا اور اگر کم ملے گی تو کوئی شخص اس شے کی تیاری پر سرمایہ صرف نہ کریگا ۔ لہٰذا مقدار مطلوب پہلی صورت میں بڑھیگی اور دوسری صورت میں کم ہوگی ۔

اب ہر دو قوانین مذکورہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ چونکہ ان دونوں میں ایک قسم کا اختلاف ہے اس واسطے تبادلۂ اشیاء کے لئے ضروری ہے کہ ان کی طلب و رسد میں ایک مساوات پیدا ہو ۔ ورنہ تبادلہ محال ہوگا ۔ اور جب تبادلہ محال ہوگا تو قدر کی تعیین کس طرح ہوگی ۔ لہٰذا مختلف اقتصادی اسباب کے اثر سے اشیاء کی طلب اور رسد میں خود بخود ایک مساوات پیدا ہو جاتی ہے ۔ جسکو بطور قانون کے اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر منڈی میں اشیاء کی قیمت ان کی مقدار مطلوب اور مقدار فروختنی

کی مساوات سے متعین ہو گی - اگر مانگ زیادہ ہو گی اور رسد کم، تو اشیاء کی قیمت معمول سے زیادہ بڑھ جائیگی - علی ھٰذالقیاس اگر مانگ کم ہو گی اور رسد زیادہ تو قیمت مذکور معمول سے کم ہو جائیگی - پس اشیاء کی قیمت صحیحہ (اس اصطلاح کا مفہوم ابھی واضح ہو جائیگا) کی تعیین کے لئے یہ ضروری ہے کہ طلب اور رسد میں مساوات پیدا ہو - یعنی اشیاء کی طلب[11] ان کی رسد کے مساوی ہو -

اس قانون کے معانی کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی خاطر ہم مثال کے طور پر ایک جزیرہ فرض کرتے ہیں جہاں ایک ہزار کسان آباد ہیں - فرض کرو کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں کے لئے کھاد کی ضرورت ہے اور ہر کسان کھاد کے پانچ چھکڑوں کے عوض میں غلے کے دس پیمانے دینے کو تیار ہے - اس حساب سے گویا کھاد کے پانچ ہزار چھکڑے مطلوب ہیں جنکی قیمت فی چھکڑا دو پیمانے غلہ ہو - مگر ممکن ہے کہ قیمت مذکور پر کھاد کی رسد پانچ ہزار چھکڑوں سے زیادہ ہو یا کم - بعض آدمی شاید اس قیمت پر کھاد فروخت کرنے کی نسبت ماھیگیری پر گذارہ کرنا زیادہ فائدہ مند تصور کریں - اس طرح اگر کسان زیادہ قیمت نہ دینگے تو کھاد کی رسد مطلق نہ ہو گی - اور اگر ہو گی تو بہت کم، جو ان سب کے درمیان تقسیم ہو گی - لیکن اگر بعض کسان زیادہ قیمت دینے پر راضی ہو جائیں گے، تو قیمت کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ ماھی گیری ترک کر دینگے جو پہلے کھاد مہیا کرتے تھے - اور کھاد کی رسد پھر زیادہ ہو جائے گی - بر خلاف اس کے اگر کسی قدرتی سبب سے کھاد کی رسد زیادہ ہو جائے، تو جب تک اس کی طلب میں اس قدر زیادتی نہ ہو گی، تمام کھاد بیچنے والے ایک دوسرے کی نسبت مقابلتاً قیمت کو کم کرتے جائینگے - کیونکہ ہر ایک کی خواهش یہی ہو گی کہ میرا ذخیرہ جلد بک جائے - قدرتاً ہر شخص کو اپنا فائدہ متصور ہو گا، خواہ دوسریکا نقصان ہی کیوں نہ ہو -

---

[11] اصل عبارت میں یہاں ''مطلوب'' تھا جو نامانوس ہے - اس لئے ہم نے اسے ''طلب'' سے بدل دیا ہے - (مرتب)

مثال بالا سے قانون طلب و رسد کا مفہوم تو واضح ہوگیا ۔ لیکن ابھی اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ طلب و رسد میں مساوات کس طرح پیدا ہوتی ہے ۔ ہم نے ابھی اصطلاح مقابلہ کا استعمال کیا ہے جس کے مفہوم کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے ۔ کیونکہ اس مقابلے کے اثر سے ہی طلب و رسد کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے ۔ لہٰذا یہ بیان کرنے سے پیشتر کہ مساوات مذکور مقابلہ کے عمل سے کس طرح قائم ہوتی ہے پہلے اس کا مفہوم واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ اس اصطلاح سے مراد اس مقابلے یا تجارتی رشک سے ہے جو کسی شے کے خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ کیونکہ ہر شخص کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ کم سے کم مقدار دے اور اس کے عوض میں زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرے ۔ مقابلہ کا عمل باہمی اتحاد ، رواج اور انسانی اثرات کے منافی ہے ۔ کیونکہ ہر شخص قدرتاً اپنی ذات کے لئے کام کاج کرتا ہے ۔ جہاں چاہے اپنے مال کو فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے ۔ رواج کی پابندی اسکو کسی خاص مقام میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتی ۔ اور نیز قدرتاً ہر شخص کو اپنی ذاتی منفعت متصور ہوتی ہے ۔ کسی دوسرے کے نقصان وغیرہ کی اسے کچھ پرواہ نہیں ہوتی ۔ یہ ہے مقابلے کا اقتصادی مفہوم ۔ اب اس کا اثر سمجھنے کے لئے ذرا مثال مندرجہ بالا پر غور کرو ۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ کھاد بیچنے والے مقابلے کی وجہ سے قیمت کم کرتے جائیں گے ۔ اگر فی چھکڑا غلے کے دو پیمانے دئے جائیں، تو صاف ظاہر ہے کہ طلب اور رسد غیرمساوی ہوں گے ۔ کیونکہ کھاد فروختنی کی مقدار تو دس ہزار چھکڑا ہے ۔ لیکن مانگ صرف پانچ ہزار چھکڑوں کی ہے * ۔ اگر قیمت اس سے بھی کم ہو

---

* (حاشیہ از مصنف) — کسی شے کی رسد صرف اسی مقدار تک ہی محدود نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو، بلکہ اس تمام مقدار سے ہے جو اس شے کے بیچنے والے کسی خاص نرخ پر منڈی میں لانے کے لئے تیار ہوں، جب تک کہ شے مذکور کی طلب قائم رہے ۔ اس واسطے اس مثال میں ہم نے فرض کر لیا ہے کہ کھاد بیچنے والے دن بدن کھاد کی زیادہ سے زیادہ مقدار منڈی میں لاتے رہتے ہیں ۔

جائے تو رسد شاید ۹ ہزار چھکڑے رہ جائیگی - کیونکہ بہت سے کھاد بیچنے والے کھاد مہیا کرنے کا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جائینگے - فرضاً اگر کسان یہ سمجھکر کہ مقررہ مقدار کی نسبت زیادہ کھاد ڈالنے سے زمین کے محاصل یا پیدا وار میں سے کھاد کی اس زیادہ مقدار کی قیمت نکل آئے گی' اور اس خیال سے اور کھاد خریدنا شروع کر دیں' تو کھاد کی طلب جہاں پہلے پانچ ہزار چھکڑا تھی' اب شاید چھ ہزار چھکڑا ہو جائے گی - علی ہٰذالقیاس اگر قیمت اور کم جائے تو رسد اور بھی کم ہو جائیگی - پہلے رسد ۱۰ تھی اور طلب ۵ - پھر رسد ۹ ہو گئی اور طلب ۶ - اسی طرح طلب شاید ۷ ہو جائے اور رسد ۸ - غرضیکہ دونوں مقداریں مقابلے کے اثر سے ایک دوسرے کے قریب ہوتی جائینگی - فرض کرو کہ اس وقت جب کہ طلب اور رسد کی درمیانی نسبت ۷ : ۸ کی ہے' کھاد کی قیمت فی چھکڑا $\frac{1}{2}$ پیمانہ گیہوں پر ٹھہر گئی ہے - اب یہ بات کہ طلب اور رسد کے درمیان پوری مساوات کسی ایسی قیمت پر ہو گی جو قیمت مذکورہ سے بہت کم یا کسی قدر کم ہو' دو امور پر منحصر ہے -

(۱) کھاد کی اس مقدار کی افادت انتہائی[12] پر جو سات ہزار چھکڑوں سے زائد ہوگی -

(۲) کھاد بیچنے والوں کی کوئی اور فائدہ مند پیشہ اختیار کر سکنے کی استطاعت پر - فرضاً اگر کوئی کسان $2\frac{1}{2}$ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ۱۰ چھکڑے خرید کرے تو یہی قیمت مقرر ہو جائے گی' بشرطیکہ کوئی کھاد بیچنے والا قیمت مذکور سے کم قیمت پر کھاد مہیا کرنے پر راضی نہ ہو - لیکن اگر اس کسان کو $2\frac{1}{4}$ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے کھاد مل جائے تو وہ شاید پانچ چھکڑے اور خرید کر لے - اگر ایسا ممکن ہو تو $2\frac{1}{4}$ پیمانہ گیہوں سے ہی کھاد کی افادت انتہائی متعین ہوگی اور یہی اس کی قیمت فی چھکڑا

---

[12] Marginal Utility (مرتب) -

قرار پا جائے گی ۔ اس طرح اگر اس کو ۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو افادت انتہائی اسی نرخ سے متعین ہوگی ۔ علیٰ ہٰذا القیاس $1\frac{1}{2}$ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو یہی قیمت قرار پائے گی ۔ الغرض ممکن ہے کہ کسان اس طرح کھاد کے بیس چھکڑے خرید لیوے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ کھاد کے مختلف حصص کی افادت مختلف ہے ۔ اگر یہ کسان بیس چھکڑے کھاد کے ایک ہی دفعہ خرید لیتا تو ہر چھکڑے کے لئے اسے مساوی قیمت ادا کرنی پڑتی اور یہ قیمت $1\frac{1}{2}$ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ہوتی ۔ کیونکہ منڈی میں (بشرطیکہ مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو) ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے اور بالعموم مساوی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اسباب اشیاء کی قیمت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن ان بواعث پر ہم آگے چل کر غور کریں گے۔ فی الحال ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ

کسی شے کی قیمت صحیحہ اس قمیت سے کیوں مختلف ہوتی ہے جس پر وہی شے تجارت کی منڈی میں فروخت ہوتی ہے ؟

لفظ منڈی کی کئی تشریحات کی گئی ہیں ۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر تجارتی شے کی ایک نہ ایک منڈی ضرور ہوتی ہے ۔ مثلاً لوہے کی منڈی ، چاء کی منڈی، وغیرہ ۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک ہی قصبے میں اشیا کا تبادلہ کرنے والوں کے مختلف فریق ہوتے ہیں جن کے درمیان ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مختلف ہو۔ پس لفظ منڈی سے مراد وہ تمام افراد ہیں[13] جن کی طلب یا رسد کسی خاص مقام میں کسی خاص شے کی قیمت پر اثر کرے ۔

---

[13] یہاں الفاظ میں معمولی تغیر کیا گیا ہے ۔ اصل مسودہ میں ''وہ'' کی جگہ ''ان'' تھا اور ''ہیں'' کی جگہ ''کی ہے'' (مرتب) ۔

اگر مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو کسی شے کی قیمت ہمیشہ اس کے مصارف پیدائش کے قریب ہوگی۔ یعنی شے مذکور کی رسد کے اس حصہ کے مصارف پیدائش پر جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ قیمت گویا اس شے کی افادت انتہائی کا پیمانہ ہوگی یعنی اس حصے کی افادیت انتہائی کا جسکو خریدار اس خاص قیمت پر بغیر اندیشہ نقصان کے خریدنا قبول کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قیمت ان مساعی اور تکالیف کا معاوضہ ہوگی جو اس کے پیدا کرنے والوں کو نہایت نامساعد حالات میں کام کرنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ تمام خریدار اس شے کی مساوی قیمت ادا کریں گے اس واسطے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اسے مساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کو فائدہ ہوگا۔ یعنی ان کا اجر ان تکالیف و مساعی سے زیادہ ہوگا جو اس کی تیاری کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور جن لوگوں نے اسے نامساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کا اجر بمشکل ان کی مساعی اور تکالیف کے برابر ہوگا۔ مثلاً فرض کرو کہ چند شخص نہایت مساعد حالات میں کام کرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایک ایسی کان کھودتے ہیں جس پر معمولی محنت اور سرمایہ صرف کرنے سے عمدہ لوہا بافراط نکل آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت بدرجہا فائدے میں رہینگے جو اسی کام کو نامساعد حالات میں کرتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ایسی کان کھودتے ہیں جس سے لوہا نکالنے میں بہت سی محنت اور کثیر سرمایہ درکار ہے۔ مقدم الذکر فریق کے فائدے کی وجہ یہ ہے کہ خریدار دونوں کانوں کے لوہے کو مساوی قیمت پر ہی خریدنا قبول کریں گے۔ جس سے پہلا فریق فائدہ میں رہے گا اور دوسرے فریق کو بمشکل اپنے اصل مصارف ہی پلے پڑینگے۔

اگر لوہا بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو لوہے کی قیمت رفتہ رفتہ اس کے مصارف پیدائش[14] کے قریب آجائیگی۔ یہی قیمت جو مقابلے کی وجہ سے مصارف پیدائش کے قریب ہو جاتی ہے

---

[14] ''مصارف پیدائش'' Cost of Production کا ترجمہ ہے۔ جدید اہل قلم اسے ''مصارف پیدا وار'' کہتے ہیں۔ (مرتب)

علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قیمت صحیحہ[15] کہلاتی ہے۔ لیکن چونکہ مقابلہ کبھی پورے طور پر عمل نہیں کرتا' اسوسطے منڈی میں ہر تجارتی شے کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے جسکو اصطلاح میں قیمت متعارف[16] کہتے ہیں۔ اور یہ قیمت قیمت صحیحہ سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے بالعموم کسی شے کے مصارف پیدائش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ خریدار کے لئے اس شے کی افادت انتہائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کا یہ اختلاف مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی ہے۔

(۱) کسی شے کے ذخیرے[17] کی مقدار پر جو منڈی میں موجود ہو۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ذخیرہ اور رسد[18] مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ ذخیرے سے مراد کسی شے کی اس تمام مقدار سے ہے جو ایک خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو۔ اور رسد سے مراد کسی شے کی اس مقدار سے ہے جو فروخت کے لئے پیش کی جاسکتی ہو۔ اگرچہ منڈی میں حقیقۃً موجود نہو۔ لہٰذا ممکن ہے کہ رسد ذخیرے کا ایک تھوڑا سا حصہ ہو۔ مثلاً جب کسی شے کی قیمت کم ہو تو دکاندار قدرتاً اس شے کا سارا ذخیرہ نہیں بلکہ اسکا تھوڑا سا حصہ فروخت کے لئے پیش کرینگے' جو اس صورت میں رسد کہلائیگا۔ جب قیمت بڑھے گی وہ پہلے کی نسبت ذخیرے کی زیادہ مقدار فروخت کے لئے پیش کرینگے۔ غرض کہ قیمت کی زیادتی کے ساتھ ذخیرہ رسد کی صورت میں منتقل ہوتا جائیگا۔ بر خلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی منڈی میں رسد کی مقدار ذخیرے کی مقدار سے زیادہ ہو۔ مثلاً تجارتی دلال عموماً اشیاء کی ایک کثیر مقدار غلہ' روئی' وغیرہ مہیا کرنے کا خریداروں سے معاہدہ کرتے ہیں' حالانکہ حقیقت میں مقدار معہودہ

---

[15] Equilibrium Price (مرتب)

[16] Current Price (مرتب)

[17] Stocks (مرتب)

[18] Supply (مرتب)

اسوقت اول تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو بہت کم۔ چونکہ خریداروں کی طلب اشیاء کی روزانہ پیداوار سے نہیں بلکہ ان کے ذخیرے سے پوری ہوتی ہے' اس واسطے ممکن ہے کہ اس ذخیرے کی کمی بیشی اشیا' کی قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان اختلاف پیدا کردے۔ مثلاً اگر کسی سال کمی رسد کی وجہ سے غلے کی قیمت زیادہ رہی ہے' تو دوسرے سال اس کی کاشت زیادہ ہو گی۔ اور اس مزید ذخیرے کی وجہ سے جو اس طرح پیدا ہو گا ممکن ہے کہ قیمت معمول سے بھی کم ہو جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر غلے کی رسد کم ہے تو اسکی جگہ مکی بکنی شروع ہو جاوے۔ اس صورت میں غلے کے ذخیرے کی کمی بیشی اس کی قیمت متعارف پر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔ علیٰ ھٰذاالقیاس بعض اشیاء ذخیرہ کیا سکتی ہیں بعض میں ذخیرہ کئے جانے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ یہ سبب بھی ذخیرے کی قیمت متعارف پر اثر کرتا ہے۔ مثلاً بعض اشیاء مچھلی وغیرہ (جو ذخیرہ نہیں کیا سکتی) کی قیمت منڈی میں صبح کچھ ہوتی ہے' شام کچھ۔

(۲) محنت کی تنظیم اور کلوں کا استعمال جسکی وجہ سے محنت کے لئے کسی اور پیشے اور سرمائے کے لئے کسی اور صورت میں منتقل ہوجانا مشکل ہو جاتا ہے' قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا دوسرا سبب ہے۔ محقق مارشل فرماتے ہیں کہ ''جن پیشوں میں سرمایہ قائم کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اُن میں اشیاء کی قیمتیں بہت تغیرپذیر ہوتی ہیں''۔ تمہیں یاد ہوگا کہ طلب و رسد کی توضیح کرتے ہوئے ہم نے کھاد مہیا کرنے والوں کی مثال لی تھی۔ ایسی مثال لینے سے ہماری غرض یہ تھی کہ پیشہ' مذکور میں قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا یہ دوسرا سبب کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہاں نہ بڑی

کلوں کی ضرورت ہے نہ بڑے ہنر مند پیشہ وروں کی ۔ جن کی محنت کسی دوسرے پیشے میں منتقل ہو سکتی ہو ۔

(۳) بسااوقات رسم و رواج اور قانون سے بھی اشیاء کی قیمت متعارف متعین ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ پیشہ وروں کے عادات اور ان کے طبائع بھی بعض دفعہ قیمت کی کمی بیشی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہیں ۔ جب کسی پیشے کے دستکاروں کی یومیہ اجرت ایک دفعہ مقرر ہو گئی' پھر سالوں تک بالعموم وہی اجرت مقرر رہتی ہے ۔ خواہ دستکاروں کی تعداد پہلے کی نسبت زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے ۔ تم نے سنا ہو گا نکاح پڑھانے والے مولوی اپنی خدمت کے عوض بالعموم 1¼ روپے ہی لیا کرتے ہیں ۔ ایسی صورتوں میں افادت انتہائی کا اصول معطل ہو جاتا ہے' اور قیمت رواج سے متعین ہوتی ہے ۔ باپ اپنے مریض بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے کئی ہزار روپیہ دینے کے لئے بھی تیار ہو گا ۔ مگر رواج کے اثر سے اسے حکیم کو وہی دو روپیہ نذرانہ دینے ہوتے ہیں ۔

قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے ۔ اس کے بعض اخلاقی وجوہ بھی ہیں ۔ مثلاً بعض دفعہ دکاندار افزائش قیمت کی توقع میں اپنا ذخیرہ اشیاء فروخت کے لئے منڈی میں لاتے ہی نہیں ۔ اگرچہ نفع کی امید میں ان کو بسااوقات نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے ۔ خوردہ فروشی کی صورت میں ان اخلاقی وجوہ پر غور کرنا اور بھی ضروری ہے ۔ ہم نے اوپر بیان کیا تھا کہ اگرچہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مساوی ہوتی ہے' تاہم بعض اسباب اس مساوات کے خلاف عمل کرتے ہیں ۔ بالعموم خریدار ایسے ہوشیار نہیں ہوتے کہ اشیا خریدنے کی اصل وقعت کو سمجھتے بوجھتے ہوں ۔ اس واسطے دکاندار انہیں سادہ لوح سمجھ کر دھوکا بھی دے دیا کرتے ہیں ۔ اور اس طرح اپنی اشیا کو دگنی چوگنی قیمت پر بیچ لیتے ہیں ۔ چونکہ ہر دکاندار اس طرح نہیں کرتا' اس واسطے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی منڈی

میں ایک ھی قسم کی قیمت میں مساوات قائم نہیں رھتی ۔ اس لحاظ سے بعض مصنفین کی رائے ھے کہ خوردہ فروشی کی صورت میں اشیا کی قیمت مقابلے سے نہیں بلکہ رواج سے متعین ھوتی ھے۔ اور اس وجہ سے یہ امر معمولاً مسلم ھے کہ خوردہ فروشوں کو اصول عدل و اخلاق کے رو سے اپنے اشیا کی قیمت اس قدر لینی چاھئے کہ تجارتی لحاظ سے اس قیمت سے کم قیمت قبول نہ کی جا سکتی ھو ۔ یہی وجہ ھے کہ بعض اھل الرائے کے نزدیک خوردہ فروشی اقتصادی اصول پر نہیں بلکہ اخلاقی اصول پر مبنی ھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص خاص حدود کے اندر یہ بات صحیح ھے ۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت کا یہ حصہ بھی مقابلے کے اثر سے معرا نہیں ھے۔

باب دوم

تجارت بین الاقوام

گذشتہ باب میں ہم نے تعین قدر پر بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اشیاء تجارتی کی قدر قانون طلب و رسد کے عمل پر منحصر ہے۔ مگر اس باب میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ قانون تجارت کی ہر صورت میں صادق ہے ؟ ممکن ہے کہ جب تبادلہ اشیاء ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتا ہو تو تعیین قدر اسی قانون کے تابع ہو۔ مگر جب یہ تبادلہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان ہوتا ہو تو اختلاف حالات کی وجہ سے تعیین قدر کا کوئی اور قانون ہو۔ اس کتاب کے حصہ اول میں ہم نے بیان کیا تھا کہ اختلاف حالات کی وجہ سے علمی اصول میں تغیر آ جانا ممکن ہے۔ لہٰذا اب ہمارا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ آیا تجارت کی ہر دو مندرجہ بالا صورتوں میں قدر اشیاء کی تعیین ایک ہی اصول کے تابع ہے یا مختلف اصولوں کے تحت ۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجارت بین الاقوام کی عام خصوصیات اور اس کے فوائد سے تمہیں آگاہ کیا جائے۔ بعض محققین کی رائے میں تجارت بین الاقوام اس تجارت سے مختلف نہیں ہے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کسی نئے اصول کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہی پہلا قانون طلب و رسد یہاں بھی صادق آئے گا۔ یہ حکماء تجارت بین الاقوام پر مختلف اعتراض پیش کرتے ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) تجارت کبھی مختلف اقوام کے درمیان ہوتی ہی نہیں ۔ بلکہ افراد کے درمیان ہوتی ہے ۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان باہم تجارت کرتے ہیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ ہر دو اقوام میں سے خاص خاص افراد ہیں جو آپس میں تبادلہ اشیاء کرتے ہیں۔ لہذا تعین قدر کا جو قانون تجارت بین الافراد کی صورت میں صحیح ہے، وہی تجارت بین المالک کی صورت میں بھی صحیح ہو گا ۔

(۲) تجارت کی ہر صورت کے لئے تعین قدر کا ایک منفرد اصول ہونا چاہئے جو تمام حالات پر حاوی ہو ۔ یہ بات علمی اصول کے خلاف ہے کہ ایک ہی قسم کے واقعات کی توجیہ کے لئے مختلف قوانین وضع کئے جائیں ۔

(۳) زمانہ حال میں ایجادات کی وجہ سے فاصلہ اور بعد موانع تجارت نہیں رہے ۔ اسواسطے تجارت بین الاقوام یا بین الممالک کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرنا صحیح نہیں ہے ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ممالک کی تجارتی اغرض میں ایک قسم کی یگانگت ضرور ہے ۔ تاہم اقوام و ممالک کا اختلاف ایک ایسا صریح واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی ایک ملک کی صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس کے مختلف حصص کے درمیان محنت اور سرمایہ یا یوں کہو کہ دستکار اور سرمایہ دار بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں ۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے لفظ قوم کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ تجارتی اشیاء کے پیدا کرنے والوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مختلف اجزاء کے درمیان محنت اور سرمایہ بلا روک ٹوک حرکت کر سکتے ہوں ۔ اس تعریف کے رو سے لفظ قوم کے مفہوم میں دو شرائط داخل ہیں ۔

(۱) ہر ایک مجموعہ کے افراد کے درمیان سرمایہ اور محنت ایک مقام سے دوسرے مقام میں بلا قید منتقل ہو سکنا ۔

(۲) ایک مجموعے کے دستکاروں یا کارکنوں کا دوسرے مجموعے کی طرف منتقل نہ ہو سکنا ۔ یعنی ایک ملک کے دستکاروں یا سرمایہ داروں کا دوسرے ملک میں نہ جا سکنا ۔

مندرجہ بالا اعتراضات کا اصل منشا' زیادہ تر یہی ثابت کرنا ہے کہ خصوصاً زمانۂ حال میں ایک ملک کے دستکار اور سرمایہ دار دوسرے ممالک میں آسانی سے جا سکتے ہیں ۔ کیونکہ فاصلے کی دقتیں جو زمانہ قدیم میں حائل تھیں' اب مختلف اقسام کی ایجادات و تسہیل سفر کی وجہ سے مفقود ہو گئی ہیں ۔ ہم اس بات کو کسی حد تک تسلیم کرتے ہیں ۔ لیکن باوجود اس بات کے یہ بھی صحیح ہے کہ سرمائے اور محنت کے ایک مجموعہ افراد یا قوم کی طرف جا سکنے میں چند ایسی مشکلات ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے ۔

اول ۔ جغرافی اعتبار سے مختلف ممالک کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے جسکی مقدار بعض دفعہ بہت بڑی ہوتی ہے ۔

دوم ۔ مختلف ممالک کی طرز حکومت مختلف ہوتی ہے ۔ کہیں مطلق العنان حکومت ہے کہیں جمہوری ۔

سوم ۔ مختلف ممالک و اقوام کے مذاہب' اصول معاشرت و رسوم وغیرہ مختلف ہوتے ہیں ۔ غرض کہ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مختلف اقوام کے درمیان سرمایہ اور محنت حرکت کر ہی نہیں سکتے ۔ تاہم یہ صاف ظاہر ہے اس حرکت میں دقت ضرور ہے ۔ اور یہی دقت تجارت بین الاقوام کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرتی ہے ۔ تم جانتے ہو کہ اگر کسی ملک کے مختلف حصص کے درمیان سرمایہ اور محنت بلا روک ٹوک حرکت نہ کر سکتے ہوں' تو اس ملک میں تجارتی مقابلہ مفقود ہو گا ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مقابلے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے تجارتی اشیا کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے ۔ جس سے اگرچہ قانون طلب و رسد باطل نہیں ہو جاتا' تاہم متاثر ضرور ہوتا ہے ۔ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ

ور محنت آزادانہ حرکت نہیں کر سکتے - پس مندرجہ بالا اصول کے مطابق تجارت بین الاقوام[2] کی صورت میں مقابلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے قانون طلب و رسد کو متاثر ہونا چاہئے - موجودہ تحقیقات سے ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مندرجہ بالا سبب سے یہ قانون کس طرح اور کہاں تک متاثر ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب آگے چل کر دیا جائے گا - فی الحال ہم تجارت خارجی کے چند فوائد بیان کرنا چاہتے ہیں -

تجارت بیرونی یا تجارت بین الاقوام کے ذریعہ سے ہم وہ اشیا حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے ملک میں پیدا نہ ہوتی ہوں ' یا تو اس وجہ سے کہ ہمارے ملک کی آب و ہوا ان اشیا کی پیدائش کے لئے ناموافق ہے یا لوگوں میں صنعت و حرفت کی قابلیت ہی نہیں ہے کہ ان اشیا کو تیار کر سکیں - غرض کہ تجارت خارجی سے ہر ملک دیگر ممالک کی پیدا کردہ اشیاء سے بہرہ ور ہو سکتا ہے - علاوہ اس کے اس طریق عمل سے محنت اور سرمائے کی کارکردگی بہت بڑھ جاتی ہے - مثلاً انگلستان میں لوہا اور کوئلہ اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ وہاں اس کی پیدائش کے لئے دیگر ممالک کی نسبت محنت اور سرمایہ کم صرف ہوتا ہے - لیکن اس ملک میں ایسی زمین بہت کم ہے جو قابل زراعت ہو - وہاں کا غلہ وہاں کے باشندوں کے لئے بھی کافی نہیں ہے - اور اگر غلے کی پیداوار کو زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی ناقص زمینیں کاشت کرنی پڑیں گی' جس سے غلے کی قیمت بہت گراں ہو جائے گی - دیگر ممالک مثلاً فرانس و ہندوستان وغیرہ میں غلہ بافراط پیدا ہوتا ہے - اس لئے اگر انگلستان اپنی اشیا کا مبادلہ ان ممالک کے غلے سے کرے تو سب کو فائدہ ہوگا - ایک زمانے میں یہ خیال مروج تھا کہ بیرونی تجارت سے و فوائد ہوتے ہیں ان کا تخمینہ اس زر نقد سے لگایا جاتا ہے جو ایک ملک سے دیگر ممالک کی طرف منتقل کیا جاوے - اس بنا پر ہر ملک کے لوگ یہی تقاضا کرتے تھے کہ اشیا برآمد میں زیادتی ہو اور اشیا درآمد میں کمی

---

[2] یعنی ان کی نقل پذیری (Mobility) محدود ہے (مرتب)

کی جاوے۔ کیوں کہ اول الذکر کی زیادتی سے زر نقد ہاتھ آتا ہے اور موخرالذکر کی زیادتی سے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اس غرض کے حصول کے لئے بہت سی تجاویز عمل میں لائی جاتی تھیں ۔ برآمد کی مقدار بڑھانے کے لئے انعام دیئے جاتے تھے اور درآمد کی مقدار کو کم کرنے کے لئے طرح طرح کے محصول لگائے جاتے تھے ۔ اس طرح مختلف ممالک کے درمیان بجائے اتحاد کے اختلاف پیدا ہوتا تھا ۔ اس طریق عمل کو نظام تجارت[3] کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ۔ لیکن اب ایک مدت سے اس کا اصل مغالطہ کھل گیا ہے۔ جس کی توضیح ذیل کی مثال سے ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ انگلستان اور فرانس کی باہمی تجارت سے صرف یہی مراد ہے کہ انگلستانی لوہے کا مبادلہ فرانس کے غلے سے ہوتا رہے۔ نیز فرض کرو کہ فرانس میں ۲۷ من لوہا پیدا کرنے کے لئے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر بیس من غلے کے لئے ۔ مگر ولایت میں اس قدر سرمایہ اور محنت درکار ہے جس قدر دس من غلے کے لئے ۔ اس لئے لوہے کی قدر بلحاظ غلے کے فرانس میں انگلستان کی نسبت دگنی ہے۔ اب اگر انگلستان اور فرانس ان دونوں اشیا کا باہمی مبادلہ کریں تو دونوں کے حق میں مفید ہو گا ۔ اگر فرانس ولایت کے ہر ۲۷ من لوہے کے واسطے ۱۵ من غلہ مبادلے میں دے تو انگلستان کو ۵ من غلہ منافع میں رہے گا ۔ علیٰ ہٰذا القیاس فرانس کو بھی فائدہ ہوگا کیوں کہ فرانس ۲۷ من لوہا خود پیدا کرے تو اسے اسی قدر محنت اور سرمایہ صرف کرنا پڑے گا جسقدر ۲۰ من غلے کے پیدا کرنے کے لئے درکار ہے۔ مفروضہ صورت میں اس کو صرف ۵ من غلہ دینا پڑے گا ۔ اس لئے دونوں فائدے میں رہیں گے اور کسی کا بھی نقصان نہ ہو گا ۔

اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خارجی تجارت کے فوائد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اشیا متبادلہ کی قدر اضافی ہر دو ممالک میں مختلف ہو، ورنہ تجارت مذکور کا کچھ فائدہ نہ ہو گا ، بلکہ اخراجات باربرداری ضائع ہوں گے۔ مذکورہ اختلاف خارجی تجارت کی مقدم شرط ہے۔

---

[3] Mercantilism (مرتب)

اور اصطلاحاً اختلاف مصارف متقابلہ[4] کہلاتا ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ خارجی تجارت کی اس مقدم شرط سے دو مضرت رساں نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن سے گریز نہیں کی جا سکتی :-

(۱) اگر خارجی تجارت اختلاف مصارف متقابلہ پر مبنی ہے تو ممکن ہے کہ بعض ممالک کو دیگر ممالک سے ایسی اشیا حاصل کرنے میں فائدہ ہو جن کو وہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتے ہیں ۔

(۲) ممکن ہے کہ بعض ممالک خاص خاص اشیاء کا پیدا کرنا ترک کر دیں جن کے لئے وہ قدرتاً یا دیگر اسباب کی وجہ سے نسبتاً زیادہ موزوں ہیں ۔ اور یہ سمجھیں کہ ان خاص اشیاء کو دیگر ممالک سے تبادلے میں حاصل کرنا زیادہ مفید ہے۔ ان ہر دو نتائج کا مفہوم ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب دو مختلف ممالک ہیں۔ اور ن اور ق دو اشیاء ہیں جن کے پیدا کرنے کے لئے ہر ملک بجائے خود ایک خاص قابلیت رکھتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ الف کی قوت پیداوار ۲ ن یا ۳ ق ہے اور ب کی ۱ ن یا ۲ ق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دونوں کے درمیان کوئی تبادلہ نہ ہو تو کل پیداوار ۳ ن + ۵ق ہو گی ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ن ق سے قدر میں زیادہ ہے۔ کیوں کہ ملک الف میں دونوں کے پیدا کرنے کے لئے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر ۳ ق کی پیدائش کے لئے۔ اور ملک ب میں ایک ن کی پیدائش کے لئے اس قدر سرمایہ درکار ہے جس قدر ۲ ق کے لئے۔ لہٰذا ملک الف کے لئے تجارتی لحاظ سے بھی مناسب ہے کہ وہ صرف ن ہی پیدا کرے اور ب کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف ق ہی پیدا کرے ۔ اس کے علاوہ

---

[4] Differential Comparative Cost (مرتب)

یہ بھی ظاہر ہے ملک الف کو دونو اقسام کی اشیاء کی پیدائش میں سہولت ہے اور نیز ق کی پیدائش میں بہ نسبت ن کے اس کو زیادہ سہولت ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان نتائج کو کسی حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام خارجی تجارت اس قسم کی نہیں ہوتی جیسی کہ مثال بالا میں فرض کی گئی ہے۔ بالعموم ہر ملک ایسی اشیاء ہی تبادلے میں لیتا ہے جن کا پیدا کرنا قدرتی طور پر یا دیگر اسباب کی وجہ سے اس ملک کے لئے مشکل ہو۔ پس خارجی تجارت کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر ملک مستفید ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے کئی دیگر فوائد بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں جو مختصراً مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) خارجی تجارت کی وساطت سے ہر ملک کو بغیر کاوش کے ایسی اشیاء دستیاب ہو سکتی ہیں جن کو یہ بغیر دقت کے پیدا نہ کر سکتا۔

(۲) خارجی تجارت انقسام محنت کی ایک صورت ہے۔ جس سے ہر ملک ان اشیاء کی تیاری میں اپنا سرمایہ صرف کرتا ہے جن کے پیدا کرنے کے لئے وہ خصوصیت سے موزوں ہے اور جن کی تیاری سے فائدہ کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل ہو۔

(۳) خارجی تجارت کی وساطت سے اشیاء کی فروخت کے لئے منڈیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

(۴) خارجی تجارت کی وساطت سے مختلف اقوام کے دستکار اپنی اپنی ہنر مندی میں بے انتہا ترقی کر سکتے ہیں۔

(۵) خارجی تجارت سے مختلف اقوام کا میل جول ہوتا ہے جس سے کئی ایک تمدنی اور اخلاقی فوائد پیدا ہوتے ہیں۔

خارجی تجارت کی عام خصوصیات اور فوائد بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی وہ کون سے شرائط ہیں جن کے لحاظ سے خارجی تجارت کا منافع تبادلے کے مختلف فریقوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے ؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ خارجی تجارت کی خصوصیات ان اشیاء کی قدر پر کس طرح اثر کرتی ہیں جو اس تجارت کا مقصود ہیں ؟ یا مختصراً شرح تبادلہ کن اسباب سے متعین ہوتی ہے ؟

تجارت بین‌الافرد کی صورت میں یہ معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ فریقین تبادلہ کے درمیان شرح تبادلہ کیا ہوگی ۔ اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں پورے حالات معلوم نہیں ہوتے اور نہ ہوسکتے ہیں ۔ بھلا ہمیں کس طرح علم ہو سکتا ہے کہ ایک خاص فرد کو کسی خاص شے کی کسقدر شدید ضرورت ہے ۔ لیکن تجارت بین‌الاقوام کی صورت میں اقوام کی ضروریات کا اندازہ کسی قدر ہوسکتا ہے ۔ لہٰذا تجارت کی اس خاص صورت میں بھی بشرطیکہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ، محنت اور تجارتی اشیاء بلا روک ٹوک آ جا سکتی ہوں ، تعین قدر کا وہی پہلا اصول صحیح معلوم ہوتا ہے ، یعنی شرح تبادلہ تجارت بین‌الاقوام کی صورت میں بھی اس مساوات پر منحصر ہے جو مختلف اقوام کی طلب و رسد اشیاء کے درمیان ہو ۔* مثلاً دو ملک ہیں ا اور ب ۔ مقدم‌الذکر لوہا پیدا کرتا ہے اور موخرالذکر

---

* (حاشیہ از مصنف) یہ امر علوم ریاضیہ کی مدد سے مندرجہ ذیل طور پر ثابت ہوسکتا ہے ۔ اگرچہ اس تشریح کی ضرورت نہ تھی تاہم اس خیال سے کہ طلباء کو علوم کی باہمی استمداد کا طریق معلوم ہو ، ہم اس کو یہاں درج کرتے ہیں ۔ فرض کرو کہ دو اشیاء متبادلہ ہیں ۔ جنکو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے انکی ذاتی خواص میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ جتنی مقداروں میں چاہو تقسیم کرکے انکا باہمی تبادلہ کرتے جاؤ ، نسبت تبادلہ وہی رہے گی ۔ فرض کرو کہ ان کے تبادلے کی وہی نسبت ہے جو ق:ن سے ہے ۔ ظاہر ہے کہ ق کا ہر دسواں حصہ یا گیارھواں حصہ ن کے ہر دسویں حصے یا گیارھویں حصے کے عوض میں دیا جائیگا ۔ کیونکہ ان اشیاء کے

شراب ۔ ظاہر ہے کہ اگر الف کو شراب کی زیادہ ضرورت ہے اور ب کو لوہے کی اسقدر ضرورت نہیں ہے، تو شراب کی تھوڑی سی مقدار کے عوض میں ب کو بہت سی مقدار لوہے کی دینی ہوگی ۔ اسواسطے یہ ممکن ہے کہ کوئی ملک دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرتا رہے جنکو یہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسکا اپنا سرمایہ اور محنت ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں صرف ہوتے رہیں، جنکے پیدا کرنے کے لئے یہ خصوصیت سے موزوں ہے۔ پس ایسی اشیاء کی قدر جنکو ہم دوسرے ملک سے تبادلے میں حاصل کرتے ہیں، ان مصارف پر منحصر نہیں ہے جو ان اشیاء کو اپنے ملک میں پیدا کرنے سے ہمیں ادا کرنے پڑتے ۔ اور نہ یہ ان مصارف پر منحصر ہے جو اس ملک کو ادا کرنے پڑتے ہیں جہاں یہ پیدا کی جاتی ہیں ۔ بلکہ یہ قدر ان اشیاء کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو ہمیں ان کے عوض میں (کرایہ باربرداری کو ملحوظ رکھکر) دیگر ممالک کو تبادلے میں دینے پڑتے ہیں ۔ مثلاً اوپر کی مثال میں ملک الف میں شراب کی قدر اس لوہے کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو شراب مذکور حاصل کرنے کی غرض سے تبادلے میں دیا جاتا ہے۔

عام صورتوں میں تو یہ صحیح ہے کہ شرح تبادلہ قانون طلب و رسد کی

(بقیہ حاشیہ از مصنف صفحہ ۹۷)

مساوی حصص کے درمیان تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس یہ نتیجہ اس طرح پر ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ $\frac{\text{د ن}}{\text{د ق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ (د کو ن کے ساتھ ضرب دینے سے ہماری مراد اشیاء متبادلہ کے مساوی حصص ظاہر کرنے کی ہے۔ اس نتیجہ کو ملحوظ خاطر رکھ کے فرض کرو کہ ل ق گندم کی ایک خفیف سی مقدار ہے اور ل ن آہن کی ایک خفیف سی مقدار جو اس کے عوض میں دی جاتی ہے ۔ چونکہ گندم اور آہن دونوں ایسی اشیاء ہیں کہ انکو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے ان کے خواص ذاتیہ میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ اسواسطے ظاہر ہے کہ ایک ہی منڈی میں ان کے مساوی حصص کے درمیان نسبت تبادلہ وہی ہوگی جو ان کی کل مقداروں

رو سے ھی متعین ھوتی ھے' مگر جیسا کہ ھم پہلے بیان کر آئے ھیں تجارت بین الاقوام میں چند ایک ایسی خصوصیات ھیں جن سے یہ قانون متاثر ھوتا ھے ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸

کے درمیان ھے ۔ لہٰذا اگر ق کل مقدار گندم کی ھو جو ن یعنی کل مقدار آھن کے عوض میں دی جاتی ھے ۔ تو ل ن اور ل ق کے درمیان وھی نسبت تبادلہ ھو گی جو ن اور ق کے درمیان ھے ۔ لہٰذا $\frac{\text{ل ن}}{\text{ل ق}}$ یا ل ن $= \frac{\text{ن}}{\text{ق}} \times$ ل ق ۔

موازنہ تجارت کی حالت میں ان ھر دو مقادیر کی طلب ھر دو فریق تبادلہ کے لئے مساوی ھو گی ۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ھو تو اور تبادلے کی ضرورت پڑے گی ۔ اب دیکھو کہ ل ن یعنی آھن کی مقدار ل ق یعنی گندم کی مقدار سے $\frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ گنا بڑی ھے ۔ پس ان کی طلب کے درمیان مساوات قائم رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ھے کہ آھن کی طلب گندم کی طلب سے $\frac{\text{ق}}{\text{ن}}$ گناہ بڑی ھو ۔ جس سے یہ اصول قائم ھوتا ھے کہ ''اشیا' متبادلہ کی طلب ان مقادیر متبادلہ کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ھے'' ۔ اب فرض کرو کہ پہلے فریق تبادلہ یا ا کے پاس گندم کی مقدار س تھی اور دوسرے فریق ب کے پاس آھن کی مقدار ص تھی ۔ چونکہ تبادلے میں گندم کا ق حصہ آھن کے ن حصہ کے عوض دیا جاتا ھے اس واسطے تبادلے کے بعد مندرجہ ذیل صورت ھو گی ۔ الف کے پاس (س ۔ ق) گندم ھو گی اور ن آھن اور ب کے پاس ق گندم ھو گی اور (ص ۔ ن) آھن ۔ اگر فرضاً الف کی طلب گندم کو ۱ح (س ۔ ق) سے اور ب کی طلب گندم کو ۲ح ق سے' علی ھذا القیاس الف کی طلب آھن کو ۱ع ن سے اور ب کی طلب آھن ۲ع (ص ۔ ن) سے تعبیر کیا جائے ' تو الف تبادلے پر رضامند نہ ھو گا' جب تک کہ مندرجہ ذیل مساوات صحیح نہ ھو ۔ یعنی

اول یہ کہ بعض اوقات فریقین تبادلہ آپس میں اتفاق کر کے ایک خاص شرح تبادلہ مقرر کر لیتے ہیں۔

دوم ۔ اگر اشیاء متبادلہ کی پیدا وار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہو تو جب ان کی پیدا وار ایک ملک میں نقطۂ تقلیل تک پہنچ جائے گی تو دیگر ممالک ضرورت سے مجبور ہو کر اسی شے کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تجارت بین الاقوام کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جائے گا۔ جس سے شرح تبادلہ پر ایک نمایاں اثر ہو گا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹

اح (س - ق) × د ق = اع ن × د ن یا اح $\frac{(س - ق)}{اع ن} = \frac{د ن}{د ق}$ ۔ چونکہ مندرجہ بالا اصول کے مطابق $\frac{د ن}{د ق} = \frac{ن}{ق}$ ہے، لہٰذا اح $\frac{(س - ق)}{اع ن} = \frac{ن}{ق}$ ۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو کچھ الف کی صورت میں صحیح ہے وہی ب کی صورت میں بھی صحیح ہونا چاہئے ۔ یا یوں کہو کہ اس کی طلب آھن (یعنی ان مقادیر آھن کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) ب کی طلب گندم کے مساوی ہونی چاہئے (یعنی ان مقادیر گندم کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) ۔ لہٰذا مندرجہ ذیل مساوات ب کی صورت میں صحیح ہونی چاہئے ۔

۲ع (ص - ن) × د ن = ۲ح ق × د ق یا $\frac{۲ح ق}{۲ع (ص - ن)} = \frac{ن}{ق}$ ۔ لہٰذا کلیہ اصول یہ قائم ہوا کہ تبادلۂ اشیاء (ایسی اشیاء کے لئے جو بغیر ذاتی اوصاف کھوئے مختلف مقادیر میں تقسیم ہو سکتی ہوں) کے لئے مندرجہ ذیل دو مساواتیں صحیح ہونی چاہئے ۔

$$\frac{اح (س - ق)}{اع ن} = \frac{ن}{ق} = \frac{۲ح ق}{۲ع (ص - ن)}$$ ۔

سوم - بعض حالات یعنی بعد مسافت اور کثرت مصارف بار برداری[5] وغیرہ کی وجہ سے مختلف اقوام کے درمیان تجارتی مقابلہ مفقود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اشیاء تجارتی کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے - مثال کے لئے فرض کرو کہ فرانس میں نہایت عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے جو ہندوستان اپنی اشیاء کے تبادلے میں اس سے لیتا ہے - نیز فرض کرو کہ دیگر ممالک بعض وجوہ سے اس صنعت میں فرانس کا مقابلہ نہیں کر سکتے - اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس صنعت سے فرانس خاصتہً فائدہ اٹھائے گا - مگر جب اور قومیں فرانس کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہو جائیں گی اور کاغذ تیار کریں گی ، تو ظاہر ہے کہ کاغذ کی قدر میں فرق آ جائے گا - اور ہندوستان کو اس مقابلے کی وجہ سے فائدہ ہو گا -

چہارم - بعض اوقات ایسے موانع پیش آ جاتے ہیں کہ دو مختلف ممالک کے تجار کو تبادلہ اشیاء میں مشکلات ہوتی ہیں - مثلاً کثرت مصارف باربرداری، دلالوں کی دلالی[6] اور محصول درآمد و برآمد[7] - ان اسباب سے اشیاء کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے اور تجار کے فائدے میں کمی ہو جاتی ہے - لہٰذا یہ اسباب بھی شرح تبادلہ پر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہیں گے - غرض کہ اس قسم کے بعض اسباب اور بھی ہیں جو شرح تبادلہ پر اثر کرتے ہیں - مگر یاد رکھنا چاہئے کہ قانون کلیہ طلب و رسد ان اسباب کے اثر سے باطل نہیں ہو جاتا - ہاں اسکا عمل ان کے اثر سے متاثر ضرور ہوتا ہے - ابھی حال ہی کا ذکر ہے ولائتی شکر ہمارے ملک میں اس کثرت سے آنی شروع ہو گئی کہ ایک روپے کی پانچ سیر بکنے لگی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ملک میں لوگوں نے گنوں کی کاشت ہی چھوڑ دی - کیونکہ ولایتی شکر دیسی شکر سے مقابلتاً سستی ملتی تھی - یہ حالت دیکھکر سرکار ہند نے ولایتی شکر پر اب اسقدر محصول در آمد

---

[5] Costs of transport (مرتب)

[6] Brokerage (مرتب)

[7] Export and Import Duties (مرتب)

لگا دیا ھے کہ یہ ھماری دیسی شکر سے سستی نہ بک سکے گی ۔ اس مثال سے صاف ظاھر ھے کہ ھمارے ملک میں ولائتی شکر کی تعیین قیمت قانون طلب و رسد کا اس قدر دخل نہیں ھے جسقدر کہ سرکار دولت مدار کے حاکمانہ فعل کا ۔

اس* ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ھوتا ھے کہ جب دو ممالک آپس میں تجارت کرتے ھیں تو بسااوقات ایک ملک دوسرے ملک کا زیر بار ھو جاتا ھے ۔ جسکا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ زیر بار شدہ ملک کی اشیاء برآمد و درآمد کے درمیان مساوات قائم نہیں رھتی ۔ کیونکہ اسکو نہ صرف اپنی درآمد کے عوض میں اشیاء بھیجنی پڑتی ھیں ' بلکہ اپنے قرض کی ادائیگی میں یا تو اپنی اشیاء برآمد میں زیادتی کرنی پڑتی ھے یا مزید روپیہ ادا کرنا پڑتا ھے ۔ اس وجہ سے ایک ملک میں روپیہ کی

---

* (حاشیہ از مصنف) تبادلہ خارجی[8] کا مضمون علم الاقتصاد کا ایک بڑا ضروری حصہ ھے ۔ لیکن چونکہ اسکا تعلق زیادہ تر عمل سے ھے اور اسکا کامل طور پر سمجھنا تجربے پر انحصار رکھتا ھے ' اسواسطے ھم مختصر طور پر یہ بیان کر دیتے ھیں کہ تبادلات خارجی اس طریق عمل کا نام ھے جس کی وساطت سے قومیں ایک دوسرے کا قرض ادا کرتی ھیں ۔ قدیم زمانے میں جب ایک ملک کے سوداگر کسی دوسرے ملک کے سوداگروں کے قرضخواہ ھوا کرتے تھے ' تو مقروض ملک سے قرضخواہ ملک کی طرف زر مسکوک ارسال کرنا پڑتا تھا ۔ مگر اب یہ دقت مفقود ھو گئی ھے ۔ کیونکہ باھمی منڈیوں کے استعمال سے زر نقد کے استعمال کی ضرورت ھی پیش نہیں آتی ۔ زمانہ' حال میں تبادلے سے مراد کسی اور ملک میں زر نقد کی ایک خاص مقدار وصول کرنیکا حق ھے ۔ جسکا اظہار ایک دستاویز کی صورت میں کیا جاتا ھے ۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کلکتہ کے ایک سوداگر نے دس ھزار روپیہ کا مال ولایت کے ایک سوداگر سے خریدا ھے اور ولایت

---

[8] Foreign Exchange جدید اھل قلم اسے ''تبادلہ خارجی'' کے بجائے ''مبادلہ خارجہ'' کہتے ھیں ۔ (مرتب)

مقدار بڑھتی جاتی ھے اور دوسرے میں کم ھوتی جاتی ھے۔ جہاں روپے کی مقدار بڑھتی ھے وھاں اس کی قدر کم ھوتی ھے اور اشیاء کی قیمت بڑھتی ھے ۔ لہٰذا وھاں اشیاء کی فروخت سے زیادہ فائدہ ھوتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ ھندوستان کی برآمد اسکی درآمد سے بہت زیادہ ھے۔ چونکہ ھم اپنی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲
کا ایک اور سوداگر کسی ھندوستانی سوداگر کا مقروض ھے ۔ مذکورہ بالا طریق عمل کے رو سے کلکتہ کا سوداگر اپنے ھم وطن ھندوستانی سوداگر سے روپیہ وصول کر لیگا ۔ اور ولایت کا مقروض سوداگر اپنے ھم وطن قرضخواہ سوداگر کو رقم مذکورہ ادا کر دیگا ۔ اس طرح دونوں ملکونکا حساب بغیر ترسیل زر کے بے باق ھو جائیگا ۔ لیکن اگر کسی ملک کے سوداگر کے ذمے کچھ باقی رہ جائے ' تو وہ زر نقد کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا ۔ موجودہ تجارتی نظام میں باقی ادا کرنے کی یہ ذرا سی دقت بھی نہیں رھی' کیونکہ شہر لنڈن انگریزی قوم کی تجارتی حیثیت کی وجہ سے دنیا کا تبادلہ گاہ[9] بن گیا ھے۔ جسکی معرفت دنیا کی قومیں اپنا حساب کتاب فیصلہ کر لیتی ھیں ۔ مثلاً اگر صوبجات متحدہ امریکہ انگلستان کے قرضخواہ ھوں اور دیگر ممالک کے مقروض ھوں' تو انگلستان کے دارالسلطنت کی معرفت فیصلہ کرنے سے ممکن ھے کہ ترسیل زر کی نوبت ھی نہ آئے ۔ کیونکہ ممکن ھے کہ یہ دیگر ممالک جو صوبجات متحدہ امریکہ کے قرضخواہ ھیں خود انگلستان کے مقروض ھوں ۔ مگر باوجود اسکے ممکن ھے کہ بعض اقتصادی اسباب کا اثر اس امر کا متقاضی ھو کہ شہر لنڈن سے زر نامسکوک کی مقدار رفتہ رفتہ خارج ھو کر کم ھوتی جائے ۔ ان اسباب کے اثر کو روکنے کے لئے انگلستان کا بنک شرح سود کو زیادہ کر دیتا ھے۔ اور وھاں کے دیگر بنک بھی اسکی تقلید کرتے ھیں ۔ جس سے انگلستان میں شرح سود بالعموم متاثر ھو جاتی ھے۔ اور دیگر ممالک کے قرضخواھوں کو اس بات کی تحریک ھوتی ھے کہ وہ زیادہ شرح سود لینے کی غرض سے اپنا روپیہ انگلستان میں ھی رھنے دیں ۔

---

[9] Clearing House (مرتب)

ضروریات کے لئے انگلستان کے محتاج ہیں اسواسطے ہم زیر بار ہیں ۔ علاوہ اسکے ہم کو سلطنت ہند کے مصارف ' حکام کی تنخواہیں اور فوجی اخراجات وغیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں ۔ لہٰذا ہمارا ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ زیر بار ہوتا جاتا ہے۔ مزید برآں ہمارے ملک میں کئی وجوہ کے باعث (مثلاً خارجی حملہ آوروں کا ہندوستان کی قدیم جمع کردہ دولت کو لوٹ کر لے جانا ' اخیر کے مغلیہ بادشاہوں کی عیاشی ' عوام کی نا عاقبت اندیشی اور کمی تعلیم کی وجہ سے روپیہ کی اصل حقیقت سے بیخبری ' وغیرہ) سرمائے کی مقدار کم ہے۔ انگلستان کے قبضے میں سرمائے کی بے انتہا مقدار ہے۔ اسواسطے ہمارے ملک میں رفاہ عام کے کاموں مثلاً آب پاشی وغیرہ میں بھی اس ملک کا سرمایہ صرف ہوتا ہے جس سے انگلستان فائدہ عظیم اُٹھاتا ہے اگرچہ ہم کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے' جس کی تشریح اس کتاب کے کسی اور باب میں کی گئی ہے۔

چونکہ انگلستان کے مصارف ہمیں پونڈوں میں ادا کرنے پڑتے ہیں' اسواسطے چاندی کی قدر میں تنزل آجانے کی وجہ سے ہمیں اور بھی نقصان ہوا کرتا تھا ۔ لیکن اب اجرائے سکہ' طلائی کے باعث اس مشکل کا اندیشہ نہیں رہا ۔ مگر ہمارے نقصان کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک صنعت و حرفت کے میدان میں بہت پیچھے ہے ۔ اور اہل ملک بہ سبب کمی تعلیم کے اس ضرورت کو محسوس نہیں کر سکتے ۔ ہم صرف وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہیں اور صنعتی اشیاء کے لئے دیگر ممالک کے محتاج ہیں ۔ گذشتہ چند سالوں سے ہم نے جاپان کی تقلید کر کے صنعت کی طرف کچھ توجہ کی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریک نہایت مفید ثابت ہو گی اور اہل ملک کے لئے ہر پہلو سے نتیجہ خیز ہو گی ۔ اگرچہ ہم فی الحال اس قابل تو نہیں کہ ہمارے ملک کی تیار کردہ اشیاء یورپ کے بازاروں میں بک سکیں' تا ہم ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی بارہ لاکھ کے قریب مختلف بیرونی جزائر مثلاً ماریشس' گائینا' فجی' ٹرینیڈاڈ' وغیرہ میں آباد ہیں' جنکے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے سے ہمارے ملک کے تاجر بے انتہا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

باب سوم

زر نقد کی ماہیت اور اُسکی قدر

تبادلہ اشیاء انقسام محنت کا لازمی نتیجہ ہے ۔ مختلف ممالک بالعموم وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جن کی پیدائش کے لئے ان کی آب و ہوا اور دیگر حالات بالاختصاص موزوں ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں ان اشیاء کے تبادلے میں دیگر ممالک سے حاصل کر لیتے ہیں ۔ اس قسم کے تبادلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کی قدر کا ایک خاص معیار معین کیا جائے ۔ کیونکہ محض مبادلے سے کام نہیں چل سکتا ۔ اگر کسی کفش ساز کو ٹوپی کی ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ اسے کسی ایسے کلاہ ساز کی تلاش کرنی چاہئے جس کو جوتی کی ضرورت ہو۔ ورنہ اس کی ضرورت کا پورا ہونا ناممکن ہے ۔ لہٰذا کسی خاص شے کا تعین بطور معیار قدر ضروری ہے، جس کو ہر فرد تبادلے میں قبول کر سکے ۔ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اس غرض کے لئے مختلف اشیاء استعمال کی گئی ہیں ۔ مثلاً نمک، چاول، چاء، وغیرہ ۔ مگر چونکہ ان کے استعمال میں صدہا دقتیں تھیں، اس واسطے ضرورت نے خود بخود ایک ایسی شے دریافت کر لی جو اس غرض کو بوجہ احسن پورا کر سکتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کو پورا کر سکنے کے لئے کوئی اس قسم کی شے ہونی چاہئے جو

(۱) ذاتی قدر رکھتی ہو ۔

(۲) آسانی سے منتقل ہو سکتی ہو ۔

(۳) پرانی ہو جانے سے اس کی قدر میں تغیر نہ آ سکتا ہو۔
(۴) چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہو۔
(۵) تھوڑی مقدار میں قدر زیادہ رکھتی ہو۔
(۶) اس کی قدر بالعموم یکساں رہتی ہو۔
(۷) اس کا کھرا کھوٹا ہونا جلدی پرکھا جا سکتا ہو۔
(۸) اس کے سکے آسانی سے بن سکتے ہوں۔

غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ تمام اوصاف بطریق احسن چاندی اور سونے میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کی مہذب قوموں نے انہی دو دھاتوں کو بطور معیار قدر اختیار کر لیا' جس سے تبادلے کی دقتیں مفقود ہو گئیں۔ ذرا خیال تو کرو اگر حروف نہ ہوتے تو خیالات انسانی کے اظہار میں کس قدر دقت ہوتی۔ سونے چاندی کو اشیاء سے وہی علاقہ ہے جو حروف کو ہمارے خیالات سے ہے۔ لہٰذا اس معیار کا دریافت ہونا تمدن انسانی کی تاریخ میں ایجاد حروف سے کم وقعت نہیں رکھتا۔

فرض کرو کسی شراب فروش کو روٹی کی ضرورت ہے۔ اور وہ ایک نان فروش سے کہتا ہے کہ مجھ سے شراب لے لو اور مبادلے میں مجھے روٹی دیدو۔ مگر ممکن ہے کہ نان فروش کو یا تو شراب کی ضرورت ہی نہو یا اگر ہو تو اتنی شراب کی ضرورت نہ ہو جس کی قدر روٹی کی قدر کے مساوی ہو۔ شراب فروش روٹی لے لیتا ہے اور مبادلے میں نان فروش کو اس قدر شراب دیدیتا ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے اور بقایا حساب کو بے باق کرنے کے لئے مذکورہ بالا معیار قدر کی کچھ مقدار ادا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہ ہوتی تو شراب فروش کو معیار قدر کی زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی۔ اب فرض کرو کہ نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے کپڑے کی ضرورت ہے۔ معیار قدر کی وہ مقدار جو اس نے شراب فروش سے حاصل کی ہے جیب میں ڈالکر بزاز کی دکان پر جاتا ہے اور وہاں سے وہ شے حاصل کرتا ہے جس کی قدر اس روٹی کی قدر کے مساوی ہے جو اس نے شراب فروش کے پاس فروخت کی تھی۔ یا بالفاظ

دیگر یوں کہو کہ جو شے اس کو شراب فروش کی طرف سے واجب الادا تھی وہ بزاز نے مہیا کر دی ۔ لفظ واجب الادا پر ذرا غور کرو کیونکہ اسی لفظ میں زر نقد کی پوری حقیقت یا ماہیت مخفی ہے ۔ مثال بالا سے واضح ہوتا ہے کہ جب مبادلہ غیر مساوی ہو تو معیار قدر یا زر نقد کی ضرورت پڑتی ہے ۔ گویا زر نقد یا معیار قدر اس حق کی علامت ہے جو مبادلۂ غیر مساوی کی صورت میں ایک فریق کو دوسرے فریق پر حاصل ہے ۔ زمانہ حال میں اس معیار قدر کو زر نقد سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیا کی تمام مہذب اقوام نے اس کو اس قسم کے حقوق کی علامت قرار دیا ہے ۔ پس زر نقد اس حق کی علامت ہے جو اس شخص کو حاصل ہے جس نے کسی اور شخص کو کوئی شے دی ہے، یا اس کی کوئی خدمت کی ہے، اور اپنی خدمت یا شے کے مبادلے میں شخص مذکور سے کوئی مساوی القدر شے حاصل نہیں کی۔ یا کوئی مساوی القدر خدمت نہیں لی ۔ اس تعریف سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی ملک میں متداول ہو حقوق کی اس مقدار کی علامت ہے جو زر نقد کی عدم موجودگی کی صورت میں اس ملک کے درمیان واجب الادا ہوتی۔ یا بطور نتیجہ یوں کہو کہ جس ملک میں یہ حقوق نہیں ہیں وہاں کسی معیار قدر کے تداول کی ضرورت نہیں ہے۔

زر نقد کی ماہیت کی مزید توضیح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اعتبار یا ساکھ[1] کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں ۔ ساکھ کیا ہے؟ فرض کرو کہ مجھے ایک شے کی ضرورت ہے، لیکن اس کی خرید کے لئے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے۔ اگر اس شے کے بیچنے والوں کی نگاہوں میں میں ایک معتبر آدمی ہوں تو وہ لوگ میرے اعتبار پر مجھ کو میری ضرورت کی چیز دے دیں گے۔ گویا میں اپنے اعتبار کی وساطت سے وہ شے حاصل کرلوں گا جو زر نقد کی وساطت سے حاصل ہوتی ۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ دو کہ وعدہ ادائگی بھی وہی کام دے سکتا ہے جو زر نقد دیتا ہے۔ جس طرح زر نقد کی ادائگی ایک

---

[1] اعتبار یا ساکھ انگریزی اصطلاح Credit کا ترجمہ ہے ۔ آج کل ''اعتبار'' زیادہ مستعمل ہے۔ (مرتب)

قسم کے حق کا تحویل کرنا ہے اس طرح اعتبار کی وساطت سے اشیاء ضرورت کا حاصل کرنا بھی ایک حق کا تحویل کرنا ہے۔ یعنی جس شخص سے میں نے کوئی شے اعتبار پر لی ہے اگر عندالطلب یا کسی مقررہ معیاد کے بعد اس کو کوئی مساوی‌القدر شے اس شے کے تبادلے یا مبادلے میں نہ دوں گا تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ قانونی چارہ جوئی کر کے مجھ سے وہ رقم یا شے وصول کر لے ۔ مختصراً یوں کہو کہ زر نقد کی طرح اعتبار بھی قوت خرید کا نام ہے' اور دونوں ایک قسم کے حقوق ہیں ۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ زر نقد اور اعتبار کی ماہیت ایک ہی ہے۔ اور زر نقد اعتبار ہی کی ایک وسیع اور عام تر صورت کا نام ہے ۔ لیکن باوجود اس امر کے ان کے درمیان ایک باریک فرق ہے ' جس کا سمجھنا نہایت ضروری ہے ۔ علم‌الاقتصاد میں تمام زرنقد اعتبار ہے۔ لیکن اس قضیے کا عکس سادہ یعنی تمام اعتبار زر نقد ہے صحیح نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی دکاندار کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کسی شے کو زر نقد کے عوض میں یا اعتبار پر فروخت کرے ۔ پس جب کوئی شخص کسی شے کے عوض میں زر نقد یا روپے کی کوئی مقدار لیتا ہے تو حقیقت میں یہ اعتبار ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر اسے یقین نہ ہو کہ میں اس زر نقد کے عوض میں اور اشیاء لے سکوں گا تو وہ اس زر نقد کو کبھی قبول نہ کرے ۔ مگر فرض کرو کہ ایک سودا ہوا ہے' یعنی ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کوئی شے قرض خریدی ہے۔ عدل اس امر کا متقاضی ہے کہ مقروض کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے قرض خواہ کو اپنے قرض کی ادائگی میں کوئی شے قبول کرنے پر مجبور کر سکے ۔ اگر قرض خواہوں کو یہ اختیار ہوتا کہ اپنے قرضوں کی ادائگی میں جو شے چاہیں قبول کریں' تو خیال کرو کس قدر دقت کا سامنا ہوتا۔ پس ہر ملک کا قانون یہ اصول وضع کرتا ہے کہ اگر کسی نے کچھ قرض لیا ہو تو مقروض اپنے قرض کی ادائگی میں اپنے قرض خواہ کو کوئی خاص شے قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ خاص شے جس کو ادائگی قرض کی صورت میں مقروض قرض خواہ کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے' اصطلاحاً

نقد قانونی[2] کہلاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ بعض صورتوں میں بعض اشیاء نقد قانونی ہیں اور بعض میں نہیں۔ انگلستان میں سکہ طلائی ہر صورت میں نقد قانونی ہے۔ لیکن چاندی کا سکہ صرف ۴۰ شلنگ تک ہی نقد قانونی ہے۔ یعنی اگر قرض ۴۰ شلنگ سے زیادہ ہو تو قرض خواہ کو اختیار ہے کہ اس سکے کو قبول نہ کرے۔ اگر اس سے کم ہو تو مقروض اسے قانوناً مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سکہ سیمین کو اپنے قرض کی ادائگی میں قبول کرے۔ مندرجہ بالا تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ زر نقد تجارت اقوام میں تین ضروری مقاصد کو پورا کرتا ہے۔

(۱) تبادلہ اشیاء کا ایک وسیلہ ہے۔ جوں جوں تجارت اقوام زیادہ پیچیدہ صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے توں توں زر نقد کے استعمال کا یہ مقصد زیادہ واضح اور نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں تبادلۂ اشیاء کے لئے اسکا وجود ایسا ہی ضروری ہے جیسا اظہار خیالات کے لئے زبان کا استعمال۔ تمام ملکوں میں ٹکسالیں قائم ہیں جہاں ارکان سلطنت کے اہتمام سے سونے چاندی کے سکے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی ہر دو طرف وہاں کے شاہی نشانات وغیرہ لگائے جاتے ہیں اور ان سکوں کے بل پر دنیا کی تجارت کا دھندا چلتا ہے۔

(۲) زر نقد کا دوسرا مقصد پہلے مقصد سے بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ اشیاء کی قدر کا معیار ہے۔ لیکن یہاں ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی زر نقد کی ذاتی قدر کس امر پر منحصر ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ہم اصطلاح ''زر نقد کی قدر'' کا مفہوم ذہن نشین

---

[2] نقد قانونی Legal Tender ۔ جدید اہل قلم اس کیلئے ''زر قانونی'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ (مرتب)

کر لیں ۔ کیونکہ مل صاحب نے اس اصطلاح کے سمجھنے میں ایک غلطی کھائی ہے ۔ جو اوروں کو بھی دھوکے میں ڈال سکتی ہے ۔ تم کو معلوم ہے کسی شے کی قیمت سے مراد اس شے کی قدر سے ہے جسکا اندازہ زر نقد یا اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ پس زر نقد کی قدر سے مراد کسی اور شے کی مقدار سے ہے جو اس زر نقد کے عوض میں دی جائے ۔ مثلاً کوئی مادی شے یا خدمت ملازمین یا کوئی اور حق ملکیت کا یا کوئی قرضہ وصول کرنے کا ۔ اگر زر نقد کی ایک خاص مقدار کے عوض میں کسی شے کی بہت سی مقدار ملے تو ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر زیادہ ہے ۔ کیونکہ اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی زیادہ مقدار حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن اگر اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی کم مقدار حاصل ہو' تو ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کم ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے' یعنی اگر زر نقد کی قدر زیادہ ہو تو[3] قیمت اشیاء کم ہوتی ہے۔ اور اگر قیمت اشیاء زیادہ ہو تو زر نقد کی قدر کم ہوتی ہے۔ لیکن مادی اشیاء کی طرح حقوق (مثلاً کسی شخص سے کوئی خاص رقم وصول کرنے کا حق' وغیرہ) قرضے* اور اعتبارات بھی تجارت کے

---

[3] یہاں ''تو'' لکھے جانے سے رہ گیا تھا ' اس لئے اسکا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

* (حاشیہ از مصنف) یاد رکھنا چاہئے کہ قرض سے مراد کوئی خاص رقم یا زر نقد کی مقدار نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں۔ بلکہ علمی لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم وہ حق طلب ہے ' جو قرضخواہ کو حاصل ہے۔ یا وہ فرض ادائیگی ہے جو مقروض کے ذمے ہے۔ لہذا قرضوں کی زید و فروخت سے مراد قرضخواہ یا مقروض کے حق طلب یا فرض ادائیگی کی خرید و فروخت سے ہے۔

دائرہ میں لائے جا سکتے ھیں ۔ مثلاً فرض کرو کہ الف نے ب سے پانچ سو روپے قرض لئے ھیں ۔ ممکن ھے کہ ج الف کو پانچ سو روپے سے کچھ کم رقم ادا کر کے اس سے حق وصولی قرضہ خرید لیوے ۔ اور میعاد مقررہ کے بعد یا عندالطلب ب سے پانچ سو روپے وصول کر لیوے ۔ لہٰذا ان حقوق اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لئے بھی ویسا ھی پیمانہ مقرر ھے جیسا مادی اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے ۔ جیسے غلہ کے لئے من کا پیمانہ ' کپڑے کے لئے گز کا ۔ اسی طرح سہولت کے لئے زر نامسکوک کو بھی مختلف پیمانوں میں تقسیم کیا جاتا ھے ۔ جنکو سکے کہتے ھیں ۔ علیٰ ھٰذا القیاس قرضوں اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لئے بھی ایک پیمانہ مقرر ھے ۔ یعنی مبلغ سو روپے وصول کرنے کا حق جو اب سے ایک سال بعد واجب الادا ھو گا ۔ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی قرض کا ایک پیمانہ خریدنے کے لئے ادا کی جائے اس پیمانے کی قیمت نقد کہلاتی ھے ۔ اور اسکی خرید و فروخت کا بھی وھی حال ھے جو اور اشیاء کا ۔ یعنی ایک پیمانہ قرض خرید کرنے کے لئے زر نقد کی مقدار یا قیمت نقد جسقدر کم ادا کرنی پڑے گی اسی قدر زر نقد کی قدر زیادہ ھو گی ۔ اور جسقدر زیادہ دینی پڑے گی اسی قدر اسکی قدر کم ھو گی ۔ غرض کہ قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت میں بھی مندرجہ بالا اصول ھی صحیح ھے ۔ یعنی زر نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ھے ۔ لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ قرضوں کی خرید و فروخت کی صورت میں معمولاً زر نقد کی قدر کا اندازہ قرضے کی اس مقدار سے نہیں کیا جاتا جو اس کے عوض میں خریدی جا سکے ۔ چونکہ زر نقد قدرتاً منافع پیدا کرتا ھے ' اسواسطے ظاھر ھے کہ کسی ایسے قرضے

کی قیمت نقد جو اب سے ایک سال بعد واجب الادا ہو گا' اس قرضے کی اصل مقدار سے کم ہونی چاہئے۔ ورنہ خریدنے والے کو فائدہ ہی کیا ہو گا۔ پس زر نقد کی قدر موجودہ یا قیمت نقد منفی اصل زر یا مقدار قرضہ برابر اس منافع کے ہے جو اس قرضے کے خریدنے سے ہوتا ہے۔ اس فرق کو مٹی کاٹا[4] کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جسقدر کسی قرضے کی قیمت نقد بڑھتی یا کم ہوتی ہے اسی قدر مٹی کاٹا بھی کم ہوتا یا بڑھتا ہے۔ لہٰذا قرضوں کی خرید و فروخت کے متعلق یہ اصول قائم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور مٹی کاٹے کے درمیان نسبت مستقیم ہے' یعنی قیمت نقد کم ہو تو مٹی کاٹا زیادہ ہو گا اور اگر قیمت نقد زیادہ ہو تو مٹی کاٹا کم ہو گا۔ پس مندرجہ ذیل اصول تجارت کی سب شاخوں یعنی قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت اور اشیاء مادیہ کی خرید و فروخت پر حاوی ہے۔

زر نقد کی قدر قیمت اشیاء کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے اور مٹی کاٹا کے ساتھ نسبت مستقیم۔

اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اصطلاح زر نقد کی قدر کے دو مفہوم ہیں۔ اشیاء مادیہ اور حقوق وغیرہ کی خرید و فروخت میں تو اس سے مراد قیمت شے یا حق وغیرہ کی اس مقدار سے ہے جو اس کے عوض میں حاصل کی جا سکے۔ اور قرضوں کی خرید و فروخت میں اس کا مفہوم وہ مٹی کاٹا یا منافع ہے جو کسی شخص کو کوئی قرضہ خریدنے سے حاصل ہو۔

اس توضیح کے بعد ہم اپنے اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی سوال کی وجہ سے زر نقد کی بحث تبادلے کی ذیل میں آتی ہے' ورنہ

---

[4] مراد ہے Discount جس کے لئے جدید اصطلاح "کٹوتی" ہے۔ (مرتب)

دیگر اشیاء کی طرح اس کا ذکر بھی باب پیدائش دولت میں کیا جاتا ۔ صاف ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر دیگر اشیاء کی قدر کی طرح قانون طلب و رسد کے عمل سے متعین ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو دنیا کی تجارت زر نقد کے بل پر ہی چلتی ہے ۔ پس جس قدر استعمال زر نقد کے مواقع زیادہ ہوں گے، اسی قدر اس کی مانگ یا طلب بھی زیادہ ہو گی ۔ ہاں جب زر نقد کا کام اور وسائل سے لیا جاوے، مثلاً چکوں وغیرہ سے، تو اس کی طلب کم ہو جاتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ زر کاغذی کا استعمال زر نقد کے مواقع استعمال کو کم کرتا ہے۔ کہیں اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ زر نقد کی مانگ یا طلب کا انحصار کسی قوم کی دولت یا اس کی سالانہ پیداوار دولت کی مقدار پر ہے ۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قسم کی دولت تجارت کے دائرے میں آئے ۔ علیٰ ھٰذا القیاس اشیاء متبادلہ کی مقدار کو بھی اس مانگ سے کچھ واسطہ نہیں ہے ۔ کیونکہ بعض اشیاء کا تبادلہ صرف ایک ہی دفعہ ہوتا ہے، اور بعض کا کئی کئی دفعہ ہوتا ہے ۔ مزید براں خصوصاً زراعتی ملکوں میں بسا اوقات افراد اپنا کام زر نقد کی وساطت کے بغیر مبادلہ اشیاء[5] سے ہی چلا لیتے ہیں ۔ تم شاید یہ کہو گے کہ جب کسی ملک کا سکہ کھوٹا ہو کر یا کسی اور وجہ سے کم حیثیت ہو کر اپنا اعتبار کھو بیٹھتا ہے، تو وہاں کے لوگ اس سکے سے احتراز کرنے کی خاطر مبادلہ اشیاء سے کام چلا لیتے ہیں ۔ یا ضرورت کی اشیاء ایک دوسرے سے بدل کر سکوں کے استعمال سے بچ جاتے ہیں ۔ یہ خیال صحیح ہے مگر کسی ملک میں یہاں تک نوبت نہیں پہنچ سکتی کہ زر نقد کا استعمال بالکل جاتا رہے ۔ ہر ملک میں، بشرطیکہ وہاں کے لوگ وحشی نہ ہوں، کچھ نہ کچھ بطور زر نقد کے ضرور مستعمل ہوتا ہے ۔ پس زر نقد کی طلب کسی قوم کی دولت یا اس کی پیداوار اور دولت یا اشیاء متبادلہ کی مقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ۔ بلکہ اس کا انحصار زر نقد کے مواقع استعمال پر ہے، جو خود مختلف ممالک کی تنظیم، محنت اور دیگر حالات پر منحصر

---

[5] Barter ۔ (مرتب)

ھیں ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاھئے کہ زر نقد کی مانگ یا طلب محض خیالی امر ھی نہیں ھے، بلکہ یہ ایک حقیقت ھے۔ تم دیکھتے ھو، لوگ روپے کے عوض میں اپنی اشیاء فروخت کرتے ھیں ۔ چیزیں دیتے ھیں، اور ان کے عوض میں زر نقد قبول کرتے ھیں ۔ رسد اشیاء کی ایک معین مقدار کی صورت میں جس قدر زیادہ اشیاء زر نقد کے عوض میں ملیں گی اسی قدر زر نقد کی قدر زیادہ ھو گی ۔ یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں کم ھوں گی ۔ اور جس قدر کم اشیاء زر نقد کے عوض میں ملیں گی ، اسی قدر زر نقد کی قدر کم ھو گی ۔ یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں زیادہ ھو جائیں گی ۔

زر نقد کی رسد گویا ایک قسم کی قوت ھے جو زر نقد کے تجارتی مقاصد کو پورا کرتی ھے، اور جو اس کی مقدار اور سرعت انتقال[6] سے متاثر ھوتی ھے ۔ جس قدر زر نقد کی مقدار زیادہ ھو گی اور جس قدر عجلت سے یہ مقدار دست بدست پھر سکے گی، اسی قدر تجارتی مقاصد با حسن وجوہ اتمام پائیں گے۔ اگر زر نقد کی رسد کم ھو جائے تو اشیاء کی قیمتیں کم ھو جائیں گی ۔ کیونکہ رسد کی کمی سے زر نقد کی قدر بڑھ جائے گی ۔ علی ھذا القیاس اگر رسد زیادہ ھو جائے تو اشیاء کی قیمتیں زیادہ ھو جائیں گی ۔ کیونکہ اس صورت میں زر نقد کی قدر کم ھو جائے گی، اور اس کے عوض میں اشیاء کی زیادہ مقدار ھاتھ لگے گی ۔

اب ھم زر نقد کے متعلق ایک اور ضروری امر دریافت کرنا چاھتے ھیں ۔ یعنی مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان زر نقد کی مساوی تقسیم کس طرح ھوتی ھے ؟ زر نقد خود بخود ایک ملک سے دیگر ممالک میں منتقل ھوتا ھے ۔ اور اس وجہ سے اس کی تقسیم مساوی طور پر ھو جاتی ھے ۔ فرض کرو کہ کسی ملک (الف) میں زر نقد کی مقدار وھاں کے لوگوں کی ضرورتوں سے زیادہ ھو گئی ھے ۔ ظاھر ھے کہ وھاں اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی ۔ کیونکہ زر نقد کی زیادتی سے اس کی قدر کم ھو جائے گی ۔ اس

---

[6] مراد ھے Velocity of Circulation ۔ (مرتب)

صورت میں ب اپنی اشیاء ملک الف میں بھیجے گا۔ کیونکہ وہاں قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے فائدے کی توقع ہے۔ اس طریق سے زر نقد ملک الف سے ملک ب کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ دونوں ملکوں میں اس کی مقدار مساوی ہو جائے گی۔ لیکن ملک الف میں زر نقد کی افراط کی وجہ سے ایک اور نتیجہ بھی پیدا ہو گا۔ یعنی چونکہ اس کی قدر افراط کے سبب سے کم ہو گی۔ اس واسطے عام لوگوں کو زر نقد کے جمع کرنے کی تحریک ہو گی۔ مختلف اقسام کی صنعتوں میں چاندی یا سونے کا استعمال (جیسی صورت ہو) بڑھتا جائے گا۔ چاندی کے گلاس، حقوں کی منہالیں وغیرہ عام ہو جائیں گی۔ مزید براں وہاں کے لوگ سکوں کو پگھلا کر زر نامسکوک کی صورت میں ان ممالک کی طرف بھیجنا شروع کر دیں گے جہاں سونے چاندی کی قدر زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرضاً ملک الف میں کھرے سکے کے ساتھ ایک کھوٹا یا کم وزن کا سکہ بھی جاری ہو۔ (تم جانتے ہو، مختلف ممالک کے سکوں میں کم و بیش اختلاف ہوتا ہے۔ اکثر سکے استعمال سے ہلکے ہو جاتے ہیں۔) تو ان دونوں میں سے کس سکے کو جمع کرنے یا پگھلانے یا دیگر ممالک میں بھیجنے کی تحریک ہو گی؟ چونکہ اس ملک میں زر نقد کی افراط ہم نے فرض کر لی ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ جو سکہ کھرا یا پورے وزن کا ہوگا لوگ اسی کو جمع کرینگے، یا پگھلا کر دیگر ممالک میں بھیجینگے۔ کھوٹے یا کم وزن سکوں کی نسبت خالص اور پورے وزن کے سکوں کا جمع کرنا یا دیگر ممالک کو بھیجنا زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ کیونکہ دیگر ممالک میں سکوں کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوتی ہے جو ان میں شامل ہو۔ اسی صداقت کو گریشم صاحب ایک اقتصادی اصول کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں کہ کھوٹا یا ہلکا سکہ کھرے سکے کو دائرہ استعمال سے خارج کر دیتا ہے، اور خود اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اصول اسی صورت میں صادق آئیگا، جبکہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا

نہ ہو تو ہلکے یا کھوٹے سکوں اور کھرے سکوں کی قوت خرید میں کوئی فرق نہ ہوگا ۔ یہ کلیہ اصول مندرجہ ذیل حالات پر صادق آتا ہے

(ا) اگر کسی ملک میں صرف ایک دھات سونے یا چاندی کا کھرا سکہ متداول ہو اور اس کے ساتھ کوئی مغشوس کھوٹا یا ہلکا سکہ بھی متداول رہنے دیا جائے' تو کچھ عرصے میں کھرے سکے کی تمام مقدار دائرہ استعمال سے خارج ہو جائے گی ۔ اور صرف کھوٹا سکہ ہی استعمال میں رہے گا۔ کھرے سکے کو یا تو لوگ جمع کرتے جائینگے یا پگھلا کر رکھتے جائینگے ۔ یا دیگر ممالک سے اشیاء ضرورت کے خریدنے میں صرف کرتے جائینگے ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک میں گز کے دو پیمانے جاری ہوں ایک تین فٹ اور ایک دو فٹ کا تو کپڑے کے دکاندار قدرتاً ۲ فٹ والے پیمانے کے حساب سے اپنا کپڑا فروخت کرینگے ۔ یعنی ۲ فٹ والا گز تین فٹ والے گز کو دائرۂ استعمال سے خارج کر دیگا ۔

(ب) اگر کسی ایک ملک میں دو مختلف دھاتوں مثلاً سونے اور چاندی کے سکے ایک غیر محدود مقدار میں اکٹھے متداول ہوں اور قانونی طور پر ان کے درمیان ایک ایسی نسبت مقرر کر دی جائے جو ان کی حقیقی قدروں کی درمیانی نسبت سے مختلف ہو (یعنی کم یا زیادہ ہو) ۔ تو جس سکے کی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہوگی وہ دائرہ استعمال سے خارج ہو جائیگا ۔ اور جسکی زیادہ ہوگی وہی متداول رہے گا ۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ ایک ملک میں دو سکے غیر محدود مقدار میں متداول ہیں ۔ ایک سونے کی مہر اور دوسرا چاندی کا روپیہ ۔ اور ان کی اضافی قدر اس طرح پر ہے کہ ایک مہر مساوی بیس روپے کے ہے۔ نیز فرض کرو کہ مہر کی قانونی قدر بیس روپیہ ہے یا بالفاظ دیگر بیس روپے کو چلتی ہے۔ لیکن اس میں سونا اٹھارہ روپیہ کا ہے۔

علیٰ ھٰذا القیاس چاندی کے روپے کی قانونی قدر اسکی حقیقی قدر سے کم ہے۔ تو اس صورت میں اصول مندرجہ بالا کی رو سے روپیہ کا سکہ دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائے گا اور صرف مہر متداول رہیگی ۔ لوگ اپنی خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائیگی قدرتاً مہر کی وساطت سے کرینگے ۔ کیونکہ اس کی اصل

قدر تو اٹھارہ روپیہ ہے اور کام بیس روپے کا دیتی ہے۔ چاندی کے سکوں کو لوگ پگھلا کر زر نامسکوک کی صورت میں جمع کرینگے ۔ یا دیگر ممالک میں بھیجینگے ۔ کیونکہ ان کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوگی جو ان میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۷۶۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں چاندی کے سکے کے ساتھ سونے کا سکہ بھی جاری کیا ' تو اس کارروائی میں ناکامیابی ہوئی ۔ اور سکہ مذکور چل نہ سکا ۔ کیونکہ کمپنی کی مہر کی قانونی قدر چودہ روپیہ کے برابر مقرر کی گئی تھی' جو اسکی حقیقی قدر سے بہت کم تھی ۔ ۱۷۶۹ء میں کمپنی مذکور نے پھر ایک طلائی مہر جاری کی۔ لیکن پھر ناکامی ہوئی ۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ بنگال میں صرف ایک ہی دھات کا سکہ متداول رہنا چاہئے ۔ اور اس غرض کے لئے چاندی انتخاب کی گئی ۔ اب کچھ عرصہ سے سرکار ہند نے اس ملک میں سونے کا سکہ بھی متداول کردیا ہے' جسکی وجہ ابھی معلوم ہوگی ۔

(ج) مندرجہ بالا دو مقدمات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک ملک میں سونے کا سکہ متداول ہو اور دوسرے میں چاندی کا' تو ان کے درمیان ایک ہی نسبت تبادلہ قائم نہیں رہ سکتی۔ بلکہ چاندی اور سونے کی قیمت کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سکے خواہ سونے کے ہوں' خواہ چاندی کے ہوں' خارجی ممالک میں اپنی حقیقی قدر کے لحاظ سے قبول کئے جاتے ہیں ۔ ہمارے ملک کے روپے کی حقیقی قدر صرف ۱۱ آنے کے برابر ہے۔ اگرچہ قانوناً اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر مقرر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تو ہر شخص اسے ۱۶ آنے کے عوض میں قبول کرے گا ۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ دیگر ممالک کے لوگ بھی اس کے عوض میں ۱۶ آنے ہی دیں ۔ وہ اس کے بدلے اس کی حقیقی قدر یعنی ۱۱ آنے ہی ادا کرینگے ۔

یہ کلیہ اصول جو ہم نے بیان کیا ہے۔ علم الاقتصاد کی کتابوں میں قانون گریشم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے نتائج بڑے اہم ہیں ۔ اور یہ ایک بڑی ضروری اقتصادی بحث میں کام آتا ہے ۔ محققین کے درمیان

یہ بحث مدت سے چلی آتی ہے کہ آیا تمام دنیا کے ممالک کو یا کسی ایک ملک کو ایک ہی دھات کا سکہ بطور معیار قدر کے متداول رکھنا چاہئے یا اقتصادی لحاظ سے دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے اکھٹے متداول رہ سکتے ہیں ۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ تمام ممالک یا کسی ایک ملک میں اصل معیار قدر تو ایک ہی رہنا چاہئے' جس سے سرکار اور تجارت کے بڑے بڑے معاملے طے ہوا کریں ۔ لیکن روز کی معمولی چھوٹی چھوٹی خرید و فروخت کے لئے اور دھاتوں کے سکے متداول رہنے چاہئیں* ۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے متداول رہ سکتے ہیں' اور رہنے چاہئیں ۔

اس طریق عمل میں اقتصادی لحاظ سے کوئی نقصان نہیں ہے بشرطیکہ مختلف ممالک اتفاق کر کے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان ایک خاص نسبت مقرر کر دیں ۔ اس طویل مگر ضروری بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے' لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ قانون مذکور بالا کی رو سے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان کوئی نسبت مقرر نہیں رہ سکتی ۔ بلکہ چاندی اور سونے کی قدروں کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے ۔ تم شاید یہ کہو گے کہ سرکار ہند نے اس صحیح اصول کے خلاف کیوں عمل کیا ہے؟ یعنی ہندوستان میں کیوں دو معیار قدر جاری ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سونے کا سکہ عام استعمال کے لئے نہیں ہے ۔ ہم پہلے اشارۃً ذکر کر آئے ہیں کہ ہمیں انگلستان کو جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی ہے' وہ پونڈوں کے حساب سے دینی ہوتی ہے ۔ اس واسطے جب چاندی کی قدر میں کسی باعث سے کمی ہو جاتی تھی (بالعموم سونے کی نسبت چاندی کی قدر میں زیادہ تغیر آتے ہیں)

---

*(حاشیہ مصنف) یاد رکھنا چاہئے کہ کسی ملک میں دو یا دو سے زیادہ مختلف دھاتوں کے سکوں کا متداول ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ سب سکے بطور معیار قدر کے مستعمل ہوتے ہیں ۔ یہ تمام سکے معیار قدر اسی صورت میں سمجھے جائینگے جہاں رعایا کو یہ حق حاصل ہو کہ جب چاہے کسی دھات کی کچھ مقدار دیکر سرکاری ٹکسال سے متداول سکے بنوالے ۔

تو ہمارے ملک کی مالگذاری کو نقصان پونچتا تھا ۔ کیونکہ جہاں پہلے ایک پونڈ کے عوض میں دس روپیہ دینے پڑتے تھے' چاندی کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے ایک پونڈ کے عوض میں ۱۵ روپیہ دینے پڑتے تھے ۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے تاجروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا ۔ اسی دقت کو محسوس کرکے ہماری سرکار نے یہاں بھی سونے کا سکہ جاری کر دیا ہے۔ چونکہ یہ سکہ عام طور پر مستعمل نہیں ہے' اور ہو ہی کس طرح سکتا ہے؟ کیونکہ اس ملک کے لوگ اس قدر غریب ہیں کہ یہاں کوڑیاں بھی بطور سکے کے مستعمل ہوتی ہیں ۔ اس واسطے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک ہی معیار قدر یعنی چاندی کا روپیہ جاری ہے۔ اس طریق عمل سے ہم ان نقصانات سے جو ایک ہی معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں مامون ہیں ۔ لیکن وہ بڑے بڑے فوائد جو دو معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں ہمیں حاصل ہیں ۔

(۳) تیسرا مقصد زر نقد کا یہ ہے کہ نقد مذکور ادائیگی غیر موجل کا معیار[7] ہے ۔ فرض کرو کہ الف اور ب نے آپس میں ایک معاہدہ کیا ہے ۔ الف نے ب کو کسی قسم کا سامان دیا ہے' اور ب اس کے عوض میں معاہدہ کرتا ہے کہ بیس سال کے بعد دس ہزار روپیہ اس سامان کے عوض میں ادا کریگا ۔ فرض کرو کہ اس عرصہ میں روپیہ کی قدر میں ایک بہت بڑا تغیر آگیا ہے' یعنی جو چیز معاہدہ کے وقت آٹھ آنے کو بکتی تھی' اب ایک روپیہ کو ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قرض کی ادائیگی میں الف گھاٹے میں رہیگا ۔ اور ب بہت فائدہ میں ۔ اس قسم کی اور صورتوں کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ معیار قدر کوئی ایسی شے ہونی چاہئے جس کی قدر میں تغیر نہ آتا ہو ۔ یا کمی بیشی نہ ہوتی ہو ۔ ایسی شے تو شاید دنیا بھر میں کوئی نہ ملے ۔ ہاں بعض اشیاء کی قدر میں دیگر اشیاء کی

---

[7] Standard of Deferred Payment (مرتب)

نسبت کم تغیر آتا ہے۔ انہیں میں سے سونا اور چاندی دو دھاتیں ہیں، جو بالعموم اپنی قدر میں یکساں رہتی ہیں۔ اگرچہ بعض دفعہ ان کی قدر میں بھی تغیر ہو جانے سے دقتوں کا سامنا ہوا ہے۔ تاہم نسبتاً ان کی قدر تغیر سے آزاد رہتی ہے۔ لہٰذا یہ ان قرضوں کی ادائیگی کی صورت میں بھی کام دے سکتی ہیں جن میں مدت کو دخل ہے۔ بعض محققین ان مشکلات سے بچنے کے لئے جو زر نقد کی قدر کے تغیر سے پیدا ہوتی ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ ادائیگی غیر معجل یا ایسی ادائیگی کی صورت میں جس میں مدت کو دخل ہے، معیار قدر غلہ کو قرار دینا چاہئے۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ عام لوگوں کو سونے چاندی کے ساتھ ایک خاص قسم کا اُنس اور دل بستگی پیدا ہوگئی ہے، جس کا دور کرنا مشکلات سے ہے۔ بعضوں نے ان مشکلات سے بچنے کی اور تجاویز بھی پیش کی ہیں، جن کا اس کتاب میں بیان کرنا کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

باب چہارم

حق الضرب*

اس باب میں ہم ایک ایسے سوال پر بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا فیصلہ گذشتہ اقتصادی اصولوں پر انحصار رکھتا ہے۔ لیکن مبتدی کو خبردار رہنا چاہئے کہ یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے۔ اور اس کا پورا مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے غلط استدلالات سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس خارستان میں قدم رکھنے سے پیشتر اپنا دامن سنبھال لینا چاہئے ۔ اور ان تمام گڑھوں سے واقف ہو جانا چاہئے، جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کار منطقیوں اور مصنفوں کو منہ کے بل گرا دیا ہے۔ ایک محقق تحریر فرماتے ہیں کہ جو مصنف زر نقد کے خطرناک مضمون کو چھوتا ہے، وہ ہر لحظہ معرض خطر میں ہے، کیوں کہ استدلالی اغلاط شیر اور چیتوں کی طرح اس کے گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اس اندیشہ کو مدنظر رکھ کر ہم اس بحث کو ایک اقتصادی اصطلاح کی تشریح سے شروع کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس دقیق مضمون کی تفہیم کے لئے یہی راہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتی ہے ۔ مبتدی کو لازم ہے کہ ہر جملے اور اصطلاح کے معانی کامل طور پر ذہن نشین کرتا جائے، ورنہ وہ اس اہم اقتصادی بحث کی غرض و غایت اور اس کے نتائج سے پوری آگاہی حاصل نہ کر سکے گا۔

---

* اس سے مراد وہ معاوضہ ہے۔ جو حکومت سکہ سازی کے مصارف کے سلسلہ میں لیتی ہے اور معاشیات کی اصطلاح میں اسے Cost of Coinage کہتے ہیں۔ (مرتب)

ہر ملک میں یہ امر قانونی طور پر فیصلہ پاتا ہے کہ زر نا مسکوک یا سونے چاندی کی کسی خاص مقدار کے کس قدر سکے گھڑے جائیں۔ مثلاً انگلستان کے موجودہ قانون کی رو سے ۴۰ پونڈ سونے کے ۱۸۶۹ سکے بنائے جاتے ہیں، جو ساورن[1] کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ سکوں کی یہ تعداد جن میں زر نا مسکوک کی کوئی مقدار قانوناً منقسم کی جاتی ہے، اس مقدار کی قیمت ضربی[2] کہلاتی ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سکہ قانونی لحاظ سے پورے وزن کا ہو اس کی قدر ہمیشہ اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی قدر کے مساوی ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ کے روز مرہ استعمال سے سکوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہوجاتا ہے۔ بالعموم خرید و فروخت میں لوگوں کو اس امر کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی سکہ وزن کا پورا ہے یا کم ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ بہت عرصہ تک متداول رہنے سے بعض سکوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جائے اور بیع و شری میں ان کی قدر وہی تصور کی جائے جو قانوناً مقرر ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی سکے میں ۱۶ آنے کی چاندی ہے، اور ۱۶ آنے کو ہی چلتا ہے۔ ممکن ہے کہ کثرت استعمال سے اس کا وزن کم ہو جائے، یعنی اس کی چاندی پندرہ آنے کی رہ جائے۔ لیکن بیع وشری میں ۱۶ آنے کو ہی چلتا رہے۔ عام خرید و فروخت میں سکوں کے وزن کی کمی کچھ اثر نہیں کرتی۔ لیکن جب ان کا تبادلہ زر نامسکوک سے کیا جائے تو یہ اثر ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں زر نامسکوک اسی قدر ملے گی جس قدر سکوں کا موجودہ وزن ہے۔ اگر کثرت استعمال سے ان کا وزن قانونی وزن سے کم ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ زر نامسکوک کی کوئی خاص مقدار تبادلے میں لینے کے لئے سکوں کی زیادہ تعداد دینی پڑے گی۔ پس متداول سکوں کی وہ تعداد جو حقیقی طور پر زر نامسکوک کی کسی مقدار کی ہم وزن ہے، مقدار مذکور کی قیمت متعارف[3] کہلاتی ہے۔ اور چوں کہ کمی وزن کی صورت میں زر نامسکوک کی کسی مقدار کے عوض میں متداول سکوں کی زیادہ تعداد دینی پڑتی ہے اس

---

[1] Sovereign

[2] قیمت ضربی سے مراد ''قدر حقیقی'' یا Intrinsic Value ہے۔ (مرتب)

[3] قیمت متعارف سے مراد Face Value ہے۔ (مرتب)

واسطے ظاہر ہے کہ قیمت متعارف قیمت ضربی سے زیادہ ہوگی۔ مثلاً فرض کرو کہ چاندی کی قیمت ضربی پانچ شلنگ دو پنس فی اونس ہے' اور قیمت متعارف چھ شلنگ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ سکہ متداول کے چھ شلنگ زر نامسکوک کی مقدار کے ہم وزن ہیں' جس کا ہم وزن پانچ شلنگ ۲ پنس کو ہونا چاہئے تھا' اگر ان کا وزن کثرت استعمال کے باعث قانونی وزن سے کم نہ ہو جاتا ۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ زر نامسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جانا سکے کی کم قدر ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس توضیح سے سکہ زنی[۴] کے متعلق دو ضروری اصول پیدا ہوتے ہیں ۔

(ا) جب زر نامسکوک کی قیمت متعارف اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جاتی ہے' تو اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ سکے کی قدر کم ہوگئی ہے' بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سکۂ مذکور کی قدر کہاں تک کم ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ (زرنامسکوک کی قیمت متعارف — زر نامسکوک کی قیمت ضربی) = اس وزن کی ہے جو سکۂ متداول کی کثرت استعمال سے زائل ہوگیا ہے۔

(ب) قیمت ضربی کی تعریف سے مندرجہ ذیل اصول بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے —

زرنامسکوک کی قیمت ضربی کا بدلنا حقیقت میں سکوں کے قانونی وزن کا بدلنا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ زر نامسکوک کی قیمت ضربی مختلف حالات میں مختلف ہو سکتی ہے' تو یہ صریحاً غلط ہے۔ کیا اگر ایک من شراب کو جو کسی مٹکی میں رکھی ہو' بہت سی بوتلوں میں ڈال دیا جائے تو شراب کی مقدار بدل جائیگی ؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے حصوں میں منقسم ہو جانے سے اس کی مقدار میں فرق نہیں آ سکتا ۔

---

۴ ۔ جدید اہل قلم ''سکہ سازی'' یا تسکیک (Coinage) کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ۔ (مرتب)

اس تشریح کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ تم کو شاید معلوم ہے کہ سرکار سکہ زنی کے متعلق ایک خاص قسم کا حق رکھتی ہے جسکو حق الضرب کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس حق سے مراد زرنامسکوک کی اس مقدار سے ہے، جو سرکار بطور مصارف سکہ زنی کے لیتی ہے ۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲ آنے ہیں۔ سرکاری ٹکسال ۲ آنے وضع کرنے کی خاطر روپے میں چودہ آنہ کی چاندی ڈال کر اپنے مصارف سکہ زنی نکال لے گی۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حق الضرب دو قسم کا ہوتا ہے ۔

(۱) جب کہ حق الضرب مصارف سکہ زنی کے برابر ہو ۔ اس صورت میں سرکار کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا ۔ کیونکہ جس قدر سرکار کا خرچ ہوتا ہے ۔ اسی قدر اسے ملتا ہے[5] ۔ بعض ممالک میں حق الضرب بالکل نہیں لیا جاتا۔ مثلاً انگلستان کی ٹکسال پونڈ میں پورے بیس شلنگ کی قیمت کا سونا ڈالتی ہے ۔ بعض ممالک میں رعایا کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حق الضرب ادا کرکے یا اس کے بغیر جیسا قانون ہو سرکاری ٹکسال سے اپنے سونے یا چاندی کے ٹکڑے سکوں کی صورت میں منتقل کروا لے ۔ چنانچہ انگلستان میں سونے کے سکوں کے متعلق رعایا کو یہ حق حاصل ہے کہ بغیر حق الضرب ادا کرنے کے سونے کے ٹکڑوں کو ٹکسال سے پونڈوں کی صورت میں منتقل کروالیں ۔ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہندوستان کی رعایا کو بھی یہ حق حاصل تھا۔ اب کسی خاص مصلحت کی وجہ سے جس کا ذکر ابھی آئے گا اس ملک کی ٹکسال رعایا کے لئے بند ہے۔ اور سرکار صرف اسی قدر سکے بناتی ہے جسقدر اس ملک کی ضروریات کے لئے کافی ہو ۔

---

[5] ایسی صورت کو معاشیات کی اصطلاح میں Brassage کہتے ہیں ۔ (مرتب)

(۲) جبکہ حق ضرب مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہو - اس صورت میں سرکار سکہ زنی سے فایدہ اُٹھاتی ہے[6] - مثلاً ہمارے ہندوستان میں روپیہ ۱۶ آنے پر چلتا ہے - حالانکہ اس میں چاندی صرف ۱۱ آنے کی ہوتی ہے - گویا سرکار کو فی روپیہ ۵ آنے فائدہ ہوتا ہے - علیٰ ہٰذاالقیاس ایک پیسے میں تانبا شاید سات کوڑی کا بھی نہ ہوتا ہو - ہم ان دونوں طریقوں پر بالترتیب بحث کریں گے -

اول صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی سکے کی قدر زرنامسکوک کی اس مقدار کی قدر کے مساوی ہونی چاہئے جو اس سکے میں شامل ہے ' یا مقدار مذکور کی قدر میں مصارف سکہ زنی بھی شامل ہونے چاہئے - بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲ آنے ہوں' تو کیا روپےمیں ۱۴ آنے کی چاندی ڈالکر اسکی قدر ۱۶ آنے کے برابرمقرر کرنی چاہئے - یا ۱۶ آنے کی چاندی ڈالکر اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر ہی مقرر کرنی چاہئے - ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں سرکار کو اپنے مصارف سکہ زنی کی بابت ۲ آنے مل جائینگے - مگر دوسری صورت میں یعنی جبکہ روپے میں ۱۶ آنے کی چاندی ہو سرکار کو بطور مصارف سکہ زنی کچھ نہ ملیگا - یہ ایک بحث طلب معاملہ ہے - بعض حکما کہتے ہیں کہ سرکار کو کچھ حق ضرب نہ لینا چاہئے - یا یوں کہو کہ ان کے نزدیک مصارف سکہ زنی کی خاطر اس کی حقیقی قدرسے زیادہ قدر پر چلانا اقتصادی لحاظ سے مضر ہے - مگر بعض حکماء کے نزدیک مصارف سکہ زنی کے برابر حق ضرب لے لینے میں کوئی ہرج نہیں - اُن کے دلایل مندرجہ ذیل ہیں -

(۱) ایک قینچی کی قیمت اس کے ہموزن لوہے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے - اس واسطے کوئی وجہ نہیں کہ کسی سکے کی قدر اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی قدرسے زیادہ نہ ہو - سونا یا چاندی اپنی نامسکوک حالت میں اسقدر مفید نہیں ہوتے ' جس قدر کہ

---

[6] معاشیات کی فنی زبان میں اسے Seinorage کہا جاتا ہے (مرتب)

سکوں کی صورت میں ہوتے ہیں لہٰذا عقل اس امر کی مقتضی ہے کہ جب زر نا مسکوک سکوں کی صورت میں منتقل کر دیا جاوے، تو اسکی قدر بھی بڑھ جائیگی - جیسا کہ لوہے کے ٹکڑے کی قدر ایک زنجیر یا تلوار کی صورت میں منتقل ہو جانے سے بڑھ جاتی ہے۔

(۲) اگر کوئی حق ضرب نہ لیا جائے، یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر سکے کی قدر زر نامسکوک کی قدر کے برابر ہو جو اس میں شامل ہے، تو عوام کو جب زر نامسکوک کی ضرورت لاحق ہو گی سکوں کو پگھلا لیا کریں گے، اور جب سکوں کی ضرورت ہو گی اسی زر نامسکوک کو سرکاری ٹکسال سے پھر سکوں کی صورت میں منتقل کرا لیا کریں گے۔ یہ عمل بار بار ہوتا رہے گا - جس سے سرکار کو بیجا نقصان ہو گا - کیونکہ سرکار کو بغیر مصارف سکہ‌زنی لئے سکے بنانے پڑیں گے۔ یہ دلیل واقعی زبردست ہے۔ مگر باوجود اس بات کے دنیا کے بعض بڑے بڑے تجارتی ملکوں مثلاً انگلستان وغیرہ حق ضرب نہیں لیتے - وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک فائدہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انگلستان میں سکے کی مقدار تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے (تجارتی ملکوں میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے) تو اس افراط کے باعث ان کی قدر کم ہونے نہیں پاتی - یا یوں کہو کہ انگلستان میں اشیاء کی قیمتیں زیادہ نہیں ہونے پاتیں - کیونکہ سکوں کی یہ غیر ضروری مقدار فوراً دیگر ممالک کیطرف خود بخود منتقل ہو جاتی ہے۔ اور دیگر ممالک کے لوگوں کو اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا - کیونکہ عذر تو اس صورت ہو سکتا ہے جبکہ اس کی قدر اپنے ہم وزن زر نا مسکوک کی قدر سے زیادہ ہو - دیگر ممالک کے نزدیک جیسا زر نامسکوک ویسا انگلستان کا زر مسکوک۔ مثلاً اگر کابل کے سکے میں ۱۰ آنے کی چاندی ہو اور وہ ۱۰ آنے پر ہی چلتا ہو - یا یوں کہو کہ کابل

حق ضرب نہ لیتا ہو، تو ہندوستان کے لوگوں کو بشرطیکہ ان کو چاندی کی ضرورت ہو، اسے ۱۰ آنے پر خریدنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ غرض کہ انگلستان حق ضرب نہ لینے سے زر نقد کی افراط کے برے نتائج سے بچ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں حق ضرب چونکہ مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس واسطے سرکار ٹکسال کے اجرا سے فایدہ آٹھاتی ہے۔ اکثر ممالک کے بادشاہوں نے اس طریق عمل سے بے انتہا فایدہ آٹھایا ہے۔ مگر پیشتر اسکے کہ ہم اسپر کوئی رائے زنی کریں ایک نہائت ضروری اقتصادی اصول کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اشیاء کی قیمت طلب و رسد کی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ سونا اور چاندی جو اشیاء میں داخل ہیں اس کلیہ قانون کے دائرہ عمل سے خارج ہوں۔ جب سونے چاندی کی مقدار ضرورت سے بڑھ جائیگی تو ان کی قدر ضرور کم ہوگی۔ اور جب ان کی مقدار ضرورت سے کم ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ ان کی قدر زیادہ ہوگی۔ سکے جو سونے اور چاندی سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے کہ افراط کی صورت میں ان کی قدر کم ہوتی ہے اور کمی کی صورت میں ان کی قدر بڑھتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی ملک میں زرنقد کی مقدار اس ملک کی تجارتی ضروریات سے بہت کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زرنقد کی قدر بہ سبب کمی رسد کے بڑھ جائے گی۔ یا بالفاظ دیگر اشیاء کی قیمت کم ہوجائے گی اور تجارتی کاروبار نہ چل سکیگا۔ لیکن اگر کسی تدبیر سے زر نقد کی موجودہ مقدار نہائت تیزی اور سرعت کے ساتھ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو سکے، تو تجارتی کاروبار بلا روک ٹوک چلتے جائیں گے۔ اشیاء کی قیمت اصلی حالت پر عود کر آئے گی اور مزید زر نقد کی ضرورت لاحق نہ ہو گی۔ پس ایسے ملک کے تجارتی مقاصد آسانی کے ساتھ پورے نہیں ہو سکتے۔ جب تک اس ملک میں زر نقد کی مقدار زیادہ نہ ہو۔ یا کوئی صورت

اعتبار کی نہ استعمال کی جائے' یا اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو کسی طرح مقدار موجود میں سرعت انتقال نہ پیدا ہو ۔ کیونکہ سرعت انتقال بھی ایک طرح کی ازدیادی زرنقد ہے۔ جو سکہ پہلے ایک دفعہ استعمال ہوتا تھا ممکن ہے کہ سرعت انتقال کی صورت میں دس دفعہ استعمال ہو ۔ یا یوں کہو کہ اس طریق سے ایک سکہ وہی کام کر سکتا ہے جو ازدیادی زرنقد کی صورت میں دس سکوں کی وساطت سے پورا ہوتا ۔

گویا زر نقد کی سرعت انتقال کا زیادہ ہونا ایک طرح سے زر نقد کی مقدار کا زیادہ ہونا یا بالفاظ دیگر زر نقد کی قدر کا کم ہونا ہے اور اشیا کی قیمت کا بڑھنا ہے ۔ علیٰ ہٰذا القیاس زر نقد کی قدر کی زیادتی اس کی مقدار اور سرعت انتقال اور قیمت اشیا کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا جب کسی ملک میں زرنقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے کم ہو تو اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مقدار کو زیادہ کیا جاوے یا کسی تدبیر سے زرنقد کی سرعت انتقال زیادہ ہو جاوے۔ لیکن جب کسی ملک میں زرنقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے بہت بڑھ جاوے یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں' تو اس کا کیا علاج؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ زر نقد کی رسد کو محدود کر دیا جائے ۔ سنہ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہمارے ملک میں نئی کانوں کے دریافت ہونے اور ٹکسال کے عام طور پر کھلا ہونے سے روپے کی قدر بہت کم ہو کر ۱۳ پنس کے برابر رہ گئی تھی' جس سے ملک میں اشیا کی قیمتیں بڑھ گئیں اور سرکار کی مالگذاری کو نقصان ہونے لگا ۔ کیوں کہ جو روپیہ ہمیں انگلستان کی پنشنوں' تنخواہوں اور دیگر مصارف حکومت کی بابت دینا پڑتا ہے وہ مالگذاری میں سے ہی ادا کیا جاتا ہے۔ ایک پونڈ کے لئے جہاں پہلے دس روپیہ دینے پڑتے تھے چاندی کی قدر کم ہو جانے کی وجہ سے ۱۶ روپیہ دینے پڑے۔ کیوں کہ ہم کو یہ روپیہ سونے کے سکے میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا علاج سرکار ہند نے یہ کیا کہ زر نقد کی رسد محدود کر دی' یعنی ٹکسالیں بند کردیں ۔ آج کل رعایا کو یہ حق حاصل نہیں کہ چاندی کے ٹکڑے دے کر سرکاری ٹکسال سے روپیہ بنوالے ۔ بلکہ سرکار ملک کی تجارتی ضرورتوں کو

مد نظر رکھ کر خود روپیہ بناتی ہے۔ اس تجویز کی اگرچہ اس وقت مخالفت کی گئی تھی، لیکن اس کی عمدگی اس کے اثر سے ظاہر ہے، یعنی ہمارا روپیہ اب ۱۳ پنس کی جگہ ۱۶ پنس کے برابر ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے معیار قدر مقرر کی جائے اس کی قدر کا متغیر ہو جانا تمام تجارتی انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

غرض کہ مندرجہ بالا توضیح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ زر نقد کی قدر اس کی رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ رسد زیادہ ہو گی تو اس کی قدر کم ہوگی۔ اور اگر رسد کم ہو گی تو اس کی قدر بڑھے گی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر سرکار مصارف سکہ زنی سے زیادہ حق ضرب وصول کرے تو زر نقد کی قوت خرید یعنی قدر پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی ملک کی سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے زر نقد کی قوت خرید وہی رہے گی۔ کیوں کہ یہ تو صرف تبادلہ کا ایک ذریعہ ہے۔ جب تک اس کی مقدار کسی ملک کی تجارتی ضرورتوں کے مطابق ہوگی کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدر میں کوئی تغیر آئے۔ لہٰذا نتیجہ ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کی کمی بیشی اس کی رسد کی کمی بیشی پر موقوف ہے۔ حق ضرب کی کمی بیشی کو زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے ساتھ کوئی ضروری تعلق نہیں۔ اگر روپے میں ۱۱ آنے کی جگہ ۸ آنے کی چاندی ڈالی جائے یا یوں کہو کہ سرکار ہند ۵ آنے کی جگہ ۸ آنے حق ضرب لیوے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روپے کی قدر میں کمی پیدا ہو۔ روپیہ بحیثیت ایک وسیلہ تبادلہ ہونے کے بدستور ۱۶ آنے پر چلتا رہے گا۔

پس اس باب کی ساری بحث کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زر نقد کی قدر کی کمی کے دو ضروری اسباب ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے:-

اول۔ زر نامسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے زیادہ ہونا، جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے۔

دوئم۔ اس کی رسد کا تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہونا ہے۔

تم کہوگے کہ اگر حق ضرب کا زیادہ ہونا اس کی قدر پر کچھ اثر نہیں رکھتا، تو پھر ایسے سکوں کے جاری کرنے میں کیا حرج ہے جن کی قدر ان کی قدر حقیقی سے زیادہ ہو۔ بیشک سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے کوئی نقصان نہیں۔ صرف یہ بات ہے کہ اگر ایسا سکہ کثرت سے جاری کیا جاوے تو تجارت بیرونی پر برا اثر ہوتا ہے۔ کیوں کہ دیگر ممالک میں ایسے سکوں کی قدر زر نامسکوک اس مقدار کے لحاظ سے متعین ہوگی جو ان میں شامل ہے۔

———

باب پنجم

زر کاغذی

باب گذشته میں بیان ہو چکا ہے کہ سرکار جس قدر چاہے حق ضرب لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں ہماری سرکار فی الحال فی روپیہ ۰ آنے حق ضرب لیتی ہے۔ لیکن اقتصادی اصول کی رو سے اگر ۱۰ آنے فی روپیہ بھی حق ضرب لیا جائے تو ملک کی خرید و فروخت کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ روپیہ فی الحقیقت تبادلہ اشیاء کا ایک ذریعہ ہے جس کی قدر دیگر اشیاء کی طرح رسد اور طلب کی درمیانی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ مختلف ممالک میں حق ضرب کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ بعض جگہ پانچ فیصدی بعض جگہ دس فیصدی۔ لیکن کیا سکے کی کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے جس میں سرکار کے حق ضرب کی مقدار پوری سو فیصدی ہو؟ بے شک زر کاغذی کے اجرا کی صورت میں سکوں کی وہ تمام مقدار بچ جاتی ہے جو زر مذکور کے عدم اجرا کی صورت میں سرکار کو جاری کرنی پڑتی۔ اگر سرکاری اوراق جو ہمارے ملک میں متداول ہیں جاری نہ کئے جاتے تو ظاہر ہے کہ سرکار کو ان کی جگہ سکہ مذکور متداول کرنا پڑتا۔ لیکن اس زرکاغذی کی وساطت سے ہماری سرکار اس اجرا سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ یا با لفاظ دیگر یوں کہو کہ سکے کی اس خاص صورت میں ہماری سرکار نے پورے سو فیصدی حق ضرب لیا ہے۔ زر کاغذی کے پہلے موجد چین کے لوگ ہیں۔ بارھویں صدی میں جبکہ مشہور سیاح مارکوپولو نے ملک چین کا سفر کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک درخت کی چھال کا سکہ جاری ہے جولین دین میں سونے چاندی کے سکوں کی طرح استعمال ہوتا ہے۔

تیرھویں اور چودھویں صدی میں فارس اور جاپان کے حکمرانوں نے بھی چین کی تلقید کی لیکن یورپ کی اقوام نے اس کے استعمال کے فوائد صدیوں بعد محسوس کئے - زر کاغذی کی دو صورتیں ھیں -

(۱) زرکاغذی غیر متبدل[1] جو عند الطلب زرنقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرایا جا سکتا -

(۲) زرکاغذی متبدل[2] یا زر بنک جو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جا سکتا ھے - مقدم الذکر کی صورت میں یا تو خود اسے سرکار جاری کرتی ھے یا بعض دفعہ ایسا بھی ھوتا ھے کہ جب کسی تجارتی یا دیگر حادثے کے باعث کسی ملک میں زر نقد کی مقدار کم ھو گئی تو سرکار حکماً زر بنک کو زر غیر متبدل کی صورت میں منتقل کر دیتی ھے - ایسی حالت میں زر بنک کو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرا سکتے - کیونکہ سرکار کے خزانے میں زر نقد ھوتا ھی نہیں، جو اس عوض میں دیا جائے - سنہ ۱۷۹۷ء اور سنہ ۱۸۲۱ء کے درمیان انگلستان میں اور سنہ ۱۸۴۸ء میں فرانس میں یہی حالت رھی کہ سرکاری بنکوں کے اوراق عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرائے جا سکتے تھے - چونکہ زر کاغذی غیر متبدل میں اپنے آپ کو ملک کی حالت[3] اقتصادی کے تغیر کے ساتھ مطابق کرنے کی قابلیت نہیں ھے اس واسطے اس کا اجرا کچھ بہت مفید نہیں ھے -

بعض حکما کے نزدیک زر کاغذی زر نہیں کہلا سکتا کیونکہ ان کی رائے میں زر نقد کی یہ خاص صورت بحیثیت وسیلہ تبادلہ کے قومی اور تجارتی

---

[1] Incovertible Paper Money - جدید اھل قلم اسے ''غیر بدل پذیر زر کاغذی'' کہتے ھیں - (مرتب)

[2] Convertible Paper Money - یا بدل پذیر زر کاغذی (مرتب)

[3] اصل مسودہ میں یہاں ''حالات'' تھا - (مرتب)

بہبودی کے لئے مضرت رساں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل منطقی لحاظ سے بالکل ناقص ہے - اسی طرح کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں شراب کے استعمال کو بحیثیت اس کے کہ یہ پینے کی چیز ہے برا سمجھتا ہوں لہذا شراب پینے کی چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے زر نقد کے مقاصد کو انجام دیتی ہے وہ زر نقد ہے' خواہ کاغذ ہو خواہ پتھر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ زر کاغذی زر نقد کی طرح وسیلہ' تبادلہ کی حیثیت سے استعمال ہو سکتا ہے۔ اور حقیقۃً اس حیثیت سے مختلف ممالک میں استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ جوں جوں کسی ملک میں پیدائش دولت اور تجارت کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں توں توں ضرورت مجبور کرتی ہے کہ زر نقد کے مقاصد کو سر انجام دینے کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں۔ ایسے حالات میں جو شے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان مقاصد کو پورا کرے گی زر نقد یا زر نقد کی قائم مقام ہو گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زر کاغذی ہمیشہ اور ہر ملک میں زر نقد ہے۔ بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ جب کسی جگہ سکے کی یہ صورت زر نقد کے مقاصد کو پورا کرنا شروع کرتی ہے' اس وقت سے زر نقد بن جاتی ہے اور جب تک ان مقاصد کو پورا کرتی رہتی ہے زر نقد ہی بنی رہتی ہے۔ اور اگر کسی ملک کی سرکار دیوالیہ ہو جائے اور اپنے جاری کردہ اوراق کو قانوناً زر کاغذی غیر متبدل کی صورت میں منتقل نہ کرے' تو ظاہر ہے کہ سرکاری اوراق کو خرید و فروخت میں کوئی شخص قبول نہ کرے گا۔ یا یوں کہو کہ سرکاری اوراق زر نقد نہ رہیں گے۔ اسی بنا پر زر کاغذی بطور معیار قدر بھی مستعمل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو شے وسیلہ' تبادلہ ہو گی ضرور ہے کہ معیار قدر بھی ہو۔ علیٰ ھٰذا القیاس زر کاغذی ادائیگی غیر معجل کا معیار بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بالعموم یہ نقد قانونی ہوتا ہے یعنی قرض خواہ قانوناً اس کے قبول کرنے پر مجبور کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ نقد قانونی نہ بھی ہو تو بھی یہ روز مرہ کے استعمال میں غالباً ادائیگی غیر معجل کا معیار قرار پا جائیں گے۔ کیونکہ ہر شخص اشیاء کی قیمتوں کو زر نقد متداول سے تعبیر کرنے کا ایک زبردست میلان

رکھتا ہے ۔ لہٰذا زر نقد کی طرح زر کاغذی کی قدر بھی اس کی طلب و رسد پر انحصار رکھتی ہے۔ اور جس طرح ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ حق ضرب اور زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ زر کاغذی کے غیر متبدل ہونے اور اس کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری رشتہ نہیں ۔ اس کی قدر صرف ایسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جب اس کی مقدار ان سکوں کی قیمت ضربی سے زیادہ ہو، جو اس کی عدم اجراء کی صورت میں متداول کرنے پڑیں۔ اس کی ارزانی اس کے اجراء کی محرک ہوتی ہے۔ اور اس کے اجراء کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کہ سرکار کو فائدہ اٹھانا مطلوب ہو، یا کسی قومی حادثے کے باعث زر نقد کی مقدار کم ہو گئی ہو ۔ غرض کہ زر کاغذی زر نقد کے تمام مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ زر نقد نہ ہو سکے ۔ بشرطیکہ اس کی مقدار متداول زائد از ضروریات ملکی نہ ہو ۔ اگر اس کی مقدار زائد از ضرورت ہوگی تو اس کی قدر کم ہو جائے گی اور قرض خواہوں کو نقصان ہو گا ۔ مقروض فائدے میں رہیں گے، کیونکہ اس کی قوت خرید بسبب کمی قدر دن بدن کم ہوتی جائے گی ۔ اور چونکہ یہ ایک ملک سے دوسرے ممالک میں منتقل نہیں ہو سکے گا (کیونکہ دیگر ممالک کے لوگ کم قدر کے[5] سکے کو قبول نہیں کریں گے بلکہ پوری قدر قائم رہنے کی صورت میں بھی اس کا قبول کرنا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہے) اس واسطے اس ملک کی تجارت خارجی کو انتہا درجے کا نقصان پہنچے گا ۔ جہاں زر کاغذی کی قدر کم ہو گئی ہے ۔

---

[4] یہاں الفاظ بالکل کٹے ہوئے تھے اس لئے سیاق و سباق کی مناسبت سے "کرنے پڑیں" کا اضافہ کر کے انہیں درست کیا گیا ہے ۔ (مرتب)

[5] یہاں "کے" لکھنے سے رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ (مرتب)

زر بنک* اس زر کاغذی کا نام ہے جو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جا سکتا ہو۔ سرکار یا خود اپنی بنک جاری کرتی ہے یا چند اشخاص جمع ہو کر سرکار کی منظوری سے بطور خود بنک جاری کر سکتے ہیں۔ لیکن دونو صورتوں میں بنک کا چلنا بنک والوں کے اعتبار یا ساکھ پر منحصر ہے۔ اگر ان کی ساکھ نہ ہوگی تو نہ کوئی شخص ان کے جاری کردہ اوراق کو قبول کریگا۔ اور نہ ان کی تفویض میں اپنا روپیہ دیگا۔ چونکہ زر کاغذی کے تداول کی بنا ساکھ پر ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ ہر بنک کے پاس زر نقد کی ایک کافی مقدار موجود ہونی چاہئے، تاکہ جس وقت کوئی شخص کسی بنک کے اوراق کو بنک مذکور سے زر نقد کی صورت میں تبدیل کرانا چاہئے فوراً کرا سکے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو بنک کی ساکھ جاتی رہیگی۔ لہٰذا ہر بنک اس خوف کو مدنظر رکھ کر زر مسکوک کی ایک خاص مقدار اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جس قدر زر نقد کسی بنک کے پاس موجود ہے اس سے بہت زیادہ کے اوراق جاری کئے جائیں۔ ورنہ بنک کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات ساکھ یا اعتبار کے بل پر ہی ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر ممکن نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنک والے کم شرح سود کے عوض ایک سے روپیہ مستعار لیتے ہیں اور دوسرے کو زیادہ شرح سود کے عوض مستعار دیکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنک کبھی روپیہ قرض نہیں دیتا۔ بلکہ ساکھ کے بل پر اپنی موجودہ زر نقد کی مقدار سے زیادہ کے اوراق جاری کر کے یا اعتبار کی اور صورتیں پیدا کر کے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ بنک ایک قسم کی دکان ہے جہاں اعتبار بکتا ہے۔ لوگ اپنا روپیہ تجارتی ہنڈیاں اور حقوق کی دیگر صورتیں لاتے ہیں اور بنک ان کے عوض میں گویا اپنے اعتبار کی ایک مساوی مقدار دیتا ہے۔ یا یوں

---

* (حاشیہ از مصنف) لفظ بنک عام طور پر حال کی عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے اس کی جمع بنوک آتی ہے۔ لہٰذا ترکیب اضافی میں اس کا استعمال خلاف قواعد اردو نہیں ہے۔

کہو کہ وہ اپنے گاھکوں کو یہ حق دیتا ھے کہ جب چاھیں، جہاں چاھیں، اپنا روپیہ وصول کر لیں۔ یا یہ حق وصولی کسی اور کو تفویض کر دیویں، اور بصورت عدم ادائیگی اس پر نالش کر کے وصول کر لیں۔

چونکہ وہ حقوق جو بنک اپنے گاھکوں کو دیتا ھے غیر مادی ھونے کی وجہ سے قابلیت انتقال نہیں رکھتے۔ اس واسطے ضرور ھے کہ اس غرض کے لئے ان کو کاغذ پر تحریر کیا جائے۔ لہٰذا بنک یا تو اپنے اوراق جاری کرتا ھے جس کے یہ معنے ھیں کہ گاھک کو یا ورقہ بنک کے قابض کو کوئی خاص رقم عندالطلب ادا کر دی جائیگی، یا گاھک بنک کو اپنا دستی رقعہ لکھ سکتا ھے کہ کوئی خاص رقم عندالطلب فلاں شخص کو ادا کر دی جائے۔ اس قسم کے رقعہ کو چک کہتے ھیں۔ لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ جو روپیہ بنک اپنے اعتبار کے عوض میں اوروں سے وصول کرتا ھے وہ امانت نہیں ھے۔ بلکہ بنک کی ملکیت ھے جس کو بنک تجارتی اغراض میں لگا کر فائدہ اٹھاتا ھے۔ اس روپے کے بل پر وہ اعتبار کے عوض دیگر حقوق خرید کرتا ھے، اور اس کے اعتبار کی مقدار جس کے عوض میں وہ دیگر حقوق خرید کرتا ھے روپے کی اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ھوتی ھے جو اس کے پاس موجود ھوتی ھے۔ اعتبار کی اس قدر توسیع ھی اس کے فائدہ کی بنیاد ھے۔ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ھے کہ میرا اس قدر روپیہ بنک میں موجود ھے، وہ اگرچہ محاورہ، متعارف کے رو سے صحیح الفاظ استعمال کرتا ھے۔ تاھم اصول بنک کے لحاظ سے یہ استعمال صحیح نہیں ھے۔ کیونکہ بنک میں جس قدر روپیہ ھے وہ بنک کی ملکیت ھے، نہ ان اشخاص کی جن سے وہ روپیہ لیا گیا ھے۔ البتہ یہ اشخاص ایک مجرد حق کے مالک ھیں، یعنی ان کو یہ حق حاصل ھے کہ جب چاھیں، جہاں چاھیں، اپنا روپیہ وصول کر لیویں۔ پس ظاھر ھے کہ بنک کا سرمایہ اس کا اعتبار ھے۔ وہ اس عتبار کی وساطت سے روپیہ تجارتی قرضے، حقوق نالش اور دیگر اقسام کے مجرد حقوق بعینہ اس طرح خرید کرتا ھے جس طرح کوئی شے روپے کی وساطت سے خریدی جاوے۔ اور اپنے اعتبار کی قیمت بھی اسی طرح وصول کرتا ھے جیسے یہ حقیقت میں زرنقد ھے۔ جس طرح سوداگر اپنی اشیاء کو کم قیمت پر خریدتا ھے اور زیادہ قیمت پر بیچ کر فائدہ اٹھاتا ھے۔ اسی

طرح بنک بھی اپنی اشیاء یعنی اعتبارات، قرضے اور حقوق نالشی وغیرہ کو ایک شخص یعنی اپنے گاھک سے خرید کرتا ھے اور ان کو زیادہ قیمت پر اور شخص یعنی مقروض کے پاس فروخت کرتا ھے۔ کیونکہ جس قرض کو بنک خرید کرتا ھے اس کی قیمت دن بدن بڑھ رھی ھے اور بڑھتی رھے گی جب تک کہ وہ ادا نہ ھو جائے ۔ چونکہ اس خرید و فروخت سے جس کی بنا اس کے ذاتی اعتبار پر ھے بنک کو منافع ھوتا ھے۔ لہٰذا بنک کا ذاتی اعتبار اس کا سرمایہ ھے جو بنک کی موجودہ زر نقد کی مقدار سے زیادہ ھونے کے باعث ملک کے سرمائے کو بہت زیادہ کر دیتا ھے ۔

بعض محققین کی یہ رائے ھے کہ اگر زر بنک کو زر نقد کی صورت میں تبدیل کرانے میں ھر طرح کی آسانی ھو تو ھر حالت میں ایسا ھی ھوگا جیسا سونے چاندی کے سکے جن کو یہ تعبیر کرتا ھے۔ گویا زر نقد کی ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی فرق نہ ھوگا ۔ مگر اس غرض کے لئے کہ زر بنک ھر حالت میں ایسا ھی رھے جیسا کہ سونے چاندی کے سکے جنکو یہ تعبیر کرتا ھے، ضروری ھے کہ بنکوں کا انتظام نہایت صحیح اصول کے مطابق ھو ۔ اس رائے کو علم اقتصاد کی اصطلاح میں اصول بنک کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے۔ بعض حکما اس رائے کے مخالف ھیں ان کا یہ خیال ھے کہ اگر ملک کے تمام بنکوں کو یہ اختیار ھو کہ اپنے اپنے سود و زیان کو ملحوظ رکھکر جس قدر چاھیں اوراق جاری کریں تو ضروریات ملکی سے زیادہ اوراق جاری ھو جانے کا اندیشہ ھو گا ۔ لہٰذا یہ ضروری ھے کہ بنکوں کے اجرائے اوراق پر قانونی قیود ھوں۔ یہ اصول جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اصول تداول سے موسوم کرتے ھیں ۔ اول اول ملک چین میں وضع کیا گیا تھا ۔ اسی اصول پر انگلستان میں ۱۸۴۴ء میں بنک ایکٹ پاس ھوا جس کے شرائط مندرجہ ذیل ھیں :۔

(۱) بنک انگلستان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کا اختیار نہ ھو گا ۔ رقم مذکور سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کے لئے اس کے پاس زرمسکوک کی مقدار موجود ھونی چاھئے ۔

(۲) بنک مذکور کا محکمہ' اجرائے اوراق اورمحکمہ' بنک الگ الگ ہونگے۔

(۳) لنڈن کا کوئی اور بنک یا کوئی ایسا بنک جس کی معیاد ۱۸۴۴ء سے شروع ہوتی ہے اوراق نہیں جاری کر سکے گا۔ ۱۸۴۴ء سے پہلے کے بنک اپنی اوراق کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں کر سکینگے جو سن مذکور میں تھی۔

مذکورہ بالا ہردو راؤں کے مویدوں کے درمیان ایک طول طویل بحث بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے۔ اور چونکہ جانبین کے دلائل ہماری رائے میں ہم وزن معلوم ہوتے ہیں' اس واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کون سی رائے قابل ترجیح ہے۔

باب ششم

اعتبار کی ماھیت و مقاصد اور اسکا اثر اشیاء کی قیمتوں پر

جب کوئی شخص یہ حق رکھتا ھے کہ کسی دوسرے شخص سے عندالطلب یا ایک مقررہ میعاد کے بعد کوئی رقم وصول کرے یا اس سے کوئی خدمت لیوے تو اس حق کو حق اعتبار[1] کہتے ھیں ۔ مثلاً فرض کرو کہ میں کسی سوداگر سے کوئی شے اس معاھدے پر خریدتا ھوں کہ کسی خاص میعاد کے بعد اس شے کے عوض میں اس قدر رقم ادا کردوں گا ۔ ظاھر ھے کہ گویا یہ چیز میں نے اپنے اعتبار کی وساطت سے خرید کی ھے' اور اس کے عوض سوداگر مذکور کو یہ حق دیا ھے کہ اگر میں مقررہ میعاد کے بعد رقم مذکور ادا نہ کروں تو اسے اختیار ھے کہ قانونی چارہ جوئی کرکے وہ رقم وصول کر لے ۔ علیٰ ھٰذاالقیاس اگر میں کسی ڈاکخانے سے کوئی ٹکٹ والا لفافہ خرید کروں تو اس کے یہ معنے ھیں کہ مجھے ڈاکخانے پر اعتبار ھے کہ میرا خط فلاں مقام پر پہنچ جائے گا ۔ اگر مجھے یہ اعتبار نہ ھوتا تو میں اس لفافے کو ھرگز نہ خریدتا ۔ گویا میں نے اپنے پیسوں کے عوض ڈاکخانے کا اعتبار خرید کیا ھے اور ڈاکخانے نے اپنے اعتبار کے عوض میرے پیسے خرید کئے ھیں ۔

---

[1] ''اعتبار'' جیسا کہ ھم پہلے بھی اشارہ کر چکے ھیں 'Credit' کا ترجمہ ھے اور آج بھی معاشیات میں یہی اصطلاح مستعمل ھے ۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ زمانہ حال کے مہذب ممالک میں اعتبار اور دیگر حقوق بھی بطور سرمایہ مستعمل ہو کر ملک کے سرمائے کو بہت زیادہ کرتے ہیں - اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے بڑے رفاہ عام کے کام مثلاً ریلوے اور آب رسانی وغیرہ انجام پذیر نہ ہو سکتے - کیونکہ ایسے کاموں کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، جو بالعموم فرد واحد مہیا نہیں کر سکتا - بلکہ چند آدمی مل کر اپنے اعتبار پر اوروں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں، اور اس مجموعی کوشش سے بڑے بڑے عظیم الشان اور منفعت خیز کام کرکے مزید دولت پیدا کرتے ہیں -

بعض حکما اس بات پر مصر ہیں کہ کسی شخص کا ذاتی اعتبار اس شخص کی دولت میں داخل نہیں - لیکن یہ رائے صریحاً غلط ہے - ہر شے جو قوت خرید رکھتی ہے دولت ہے- اور چونکہ اعتبار کی وساطت سے بھی اشیاء اسی طرح خریدی جا سکتی ہیں جس طرح نقد روپے کی وساطت سے، یعنی اعتبار بھی قوت خرید رکھتا ہے- اس واسطے صریح نتیجہ یہ ہے کہ اعتبار دولت ہے - یہ ایک ایسا قیاس ہے جس سے کسی کو گریز نہیں ہو سکتا[2] -

اعتبار کی غرض و غایت یا مقصد تجارت کے دائرہ کو وسیع کرنا ہے- مثلاً فرض کرو کہ میں ایک کتاب کا حق تصنیف خرید کرتا ہوں - ظاہر ہے کہ جو روپیہ میں نے حق مذکور کے عوض میں دیا ہے وہ اس توقع پر دیا ہے کہ مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ منافع ہوگا - اگر یہ توقع نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ خرید کرتا - بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو روپیہ میں نے دیا ہے وہ اس منافع کی قیمت نقد ہے جو مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ حاصل کرنے کی توقع ہے- پس اس توقع یا اعتبار کی بدولت اس منافع کی قیمت نقد بھی تجارت یا خرید و فروخت کے دائرہ میں آ گئی جو ابھی حاصل ہونا ہے-

علیٰ ہٰذالقیاس جب میں کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہوں تو میری غرض یہی ہوتی ہے کہ مجھے منافع ہو - اگر مجھے کمپنی مذکور کے حصص کی خرید سے آئندہ منافع کی توقع نہ ہو یا یوں کہو کہ کمپنی مذکور پر

[2] اصل مسودہ میں ''ہو سکتی'' تھا -

اعتبار نہ ہو تو میں کبھی ان حصص کا خریدار نہ ہونگا۔ پس کمپنی کے اعتبار کی وساطت سے حصص کے آئندہ منافع کی قیمت نقد (یعنی جو روپیہ میں نے حصص کے عوض اب ادا کر دیا ہے) بھی تجارت کے دائرہ میں آ گئی۔ للہذا اعتبار کا مقصد منافع مستقبلہ کی قیمت نقد کو تجارت کے دائرہ میں لانا ہے۔ کسی فرانسیسی مصنف نے کیا خوب کہا ہے:۔

''کہ انسان مکان کو تجارت کے ذریعہ اور زمان کو اعتبار کے ذریعے فتح کرتا ہے۔''

چونکہ اعتبار اور اس کی مختلف صورتیں یعنی تجارتی ہنڈیاں، چک اور اوراق بنک، وغیرہ زر نقد کے قائم مقام ہیں، اس واسطے تھوک فروشی کی صورت میں ان کا استعمال بالخصوص مفید ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ہنڈی کئی سوداگروں کے ہاتھوں میں پھر جاتی ہے اور ان کی تجارتی ضروریات کو اس طرح رفع کرتی ہے جس طرح زر نقد۔ مثلاً فرض کرو کہ ب نے ا سے ہزار روپے کی ہنڈی لی ہے۔ ب اس ہنڈی کی پشت پر دستخط کر کے ج سے ہزار روپے کی اشیاء خرید کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح ج اس کی پشت پر دستخط کرکے د سے اشیا خرید کر سکتا ہے۔ اور یہ عمل متواتر کئی بار ہو سکتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ہنڈی مذکور میں زر نقد کی سی قوت خرید ہے اور اس کا اثر خرید و فروخت پر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ زر نقد کا۔ پس جب تک یہ ہنڈی متداول رہے گی ہزار روپے کے قائم مقام تصور کی جائے گی۔ کیوں کہ اگر ہنڈیاں اور اعتبار کی دیگر صورتیں استعمال میں نہ آتیں تو صاف ظاہر ہے کہ خرید و فروخت میں زر نقد کی ضرورت پڑتی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اشیاء کی قیمتیں زر نقد متداول کی مقدار پر منحصر ہیں۔ اگر اشیاء تجارت کی تعداد وہی رہے اور زر نقد کی مقدار بڑھ جاوے، تو ظاہر ہے کہ اشیا کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ علیٰ ھٰذالقیاس اگر اشیائے تجارت کی تعداد بڑھ جاوے اور زر نقد متداول کی مقدار بدستور وہی رہے، اور اس میں کوئی مزید سرعت انتقال پیدا نہ ہو، تو اشیا کی قیمتیں کم ہو جائیں گی۔ کیوں کہ زر نقد کی مقدار کی کمی

کے باعث اس کی قدر زیادہ ہو جائیگی - جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے عوض بہت سی اشیاء مل سکیں گی - جوں جوں کسی ملک میں اشیاء تجارت کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا یوں کہو کہ خرید و فروخت کے نئے نئے موقعے نکلتے آتے ہیں توں توں زر نقد متداول کی مقدار بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے - جن ممالک میں اسلامی جان و مال ہر طرح سے محفوظ ہیں وہاں اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اعتبار کی مختلف صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں - کیوں کہ ان سے بھی وہی کام نکلتا ہے جو زر نقد کے استعمال سے - یا اگر تجارتی ہنڈیاں یا اعتبار کی دیگر صورتیں دائرہ تجارت میں نہ آئیں تو زر نقد متداول کی مقدار کو بڑھانے کی ضرورت پڑتی، ورنہ اشیاء کی قیمتیں بہ سبب زرنقد کی قدر کے زیادہ ہو جانے کے کم ہو جاتیں - پس ظاہر ہے کہ وہ خرید و فروخت جو اب ہنڈیوں یا دیگر اعتبار کی صورتوں کی وساطت سے ہوتی ہے، زر نقد کی وساطت سے ہوتی، تو دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ ضرور پیدا ہوتا - یا زر نقد کی زیادہ مقدار متداول کرنی پڑتی، یا اشیاء کی قیمتیں کم ہو جاتیں - لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہنڈیوں کا اثر جو اشیا کی قیمتوں پر پڑتا ہے، اس کا باعث یہ نہیں کہ ہنڈی میں کوئی خاص قسم کی خصوصیت ہے - ہنڈی یا اعتبار کی اور صورت بذات خود کوئی اثر اشیا کی قیمتوں پر نہیں ڈال سکتی - بلکہ یہ اثر اس اعتبار کا نتیجہ ہے جس کا کہ ہنڈی مذکور محض ایک تحریری ثبوت یا شہادت ہے - سوداگروں کی بہیوں[3] میں جو خریداروں کا حساب درج ہوتا ہے، وہ بھی اشیا کی قیمتوں میں ویسا ہی اثر ڈال سکتا ہے - کیوں کہ یہ بھی اعتبار ہی کی ایک شکل ہے - ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ ہنڈی کی طرح بہی کا حساب دست بدست منتقل نہیں ہو سکتا - اس واسطے اس میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ اسی کی وساطت سے تجارتی اشیاء خرید کی جا سکیں - یہی وجہ ہے کہ اشیا کی قیمتوں پر حساب مذکور کا اثر محدود ہوتا ہے -

اعتبار کا ایک اور اثر یہ ہے کہ اس کا استعمال کسی خاص فرد یا

---

[3] مراد وہ رجسٹر ہے جس میں حسابات (Accounts) لکھے جاتے ہیں -

ملک کی قوت خرید کو بہت زیادہ کردیتا ہے اگر خرید و فروخت میں اعتبار سے کام نہ لیا جاتا تو اشیاء کی طلب موجودہ صورت سے بہت کم ہوتی ۔ یہ سب اسی کا ظہور ہے کہ بعض دفعہ کسی شے کی مانگ غیر محدود طور پر بڑھ جاتی ہے ۔ ۱۸۲۹ء میں جب ہماری سرکار کا ملک چین سے تنازعہ ہوا تو اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چاء کی رسد کم ہو جائے گی اور اس واسطے اس کی قیمت بہت بڑھ جائے گی ۔ لہذا اکثر دکان دار اس اثر کے خواہش مند تھے کہ شے مذکورہ کا ذخیرہ جمع کر لیں اور ضرورت کے موقع پر فائدہ اٹھائیں ۔ ایک دکاندار کے پاس صرف ۱۲۰۰ پونڈ کا سرمایہ تھا جو اس کے تجارتی کاروبار میں لگا ہوا تھا ۔ لیکن اس نے یہ تدبیر کی کہ جن سوداگروں کے ساتھ اس کی مدت سے ساکھ چلی آتی تھی ان سے اپنے نام کی سہ ماہی ہنڈیاں دے کر چاء کی ایک کثیر مقدار خرید کر لی ۔ ہنڈیوں کی معیاد ختم ہونے سے پیشتر ہی چاء کی قیمت بہت بڑھ گئی اور دکاندار مذکور نے بے انتہا فائدہ اٹھایا ۔ اگر اعتبار نہ ہوتا تو دکاندار مذکور میں یہ قوت خرید نہ ہوتی جو اس کے لئے اس قدر سود مند ثابت ہوئی ۔

حصہ چہارم

پیداوار دولت کے حصہ دار

★ لگان
★ سود
★ منافع
★ اجرت
★ مقابلہ نا مکمل

باب اول

پیداوار دولت کے حصہ دار-لگان

تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں حق ملکیت یا جائداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا ۔ محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت ہر شخص کا حصہ تھا ۔ ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے' اور یہ کسی اور کی۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا - قبائل انسانی مل کر گذران کرتے تھے اور امن وصلح کاری کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے ۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروج ہے۔ زمانہ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلیٰ اور افضل ہے ۔ نظام قدرت میں نوع انسانی کے تمام افراد مساوی حقوق رکھتے ہیں ۔ کوئی کسی کا ذلیل نہیں ہے اور تمام تمدنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی' آقا و ملازم' وغیرہ بالکل بے معنی ہیں ۔ جائداد شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے ۔ لہٰذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی اور قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروج کیا جائے ۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے ۔ کیوں کہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے' بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے ۔ جس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے ۔

حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ لیکن ہم اس کا مفصل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے ۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہئے کہ نظام تمدن کی موجودہ صورت میں جائداد شخصی ایک ضروری جزو ہے اور پیداوار محنت یعنی دولت کی تقسیم اسی کی رو سے ہوتی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن کے عمل سے دولت اپنے پیدا کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ تمام ممالک میں جہاں دستکاری ایک مرتب و منتظم صورت میں ہے دولت چار حصوں میں تقسیم ہوتی ہے[1] یعنی

(۱) زمین دار کا حصہ یا لگان ۔

(۲) سرمایہ دار کا حصہ یا سود ۔

(۳) مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع ۔

(۴) محنتی کا حصہ یا اجرت ۔

مفتوح ممالک میں دولت کا ایک پانچواں حصہ دار بھی ہوتا ہے یعنی حکمران جس کے حصے کو مالگذاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ باب ہٰذا میں ہم صرف لگان[2] کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

لگان وہ معاوضہ نقد یا جنس ہے جو زمین کے استعمال کے عوض میں مالک زمین کو ادا کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ یہ معاوضہ بالعموم نقدی یا جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے ۔ تاہم خدمت کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا

---

[1] یہاں ''ہے'' رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] Rent (مرتب)۔

ہے' جیسے ہندوستان کے[3] بعض دیہات[4] میں مالکان دہ امام مسجد کو ایک خاص قطعہ زمین کاشت کے لئے دیدیتے ہیں اور اس سے کوئی لگان نہیں وصول کرتے ۔ گویا اس کی مذہبی خدمت ہی لگان تصور کی جاتی ہے ۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زمین جس کے استعمال کے عوض میں لگان ادا کیا جاتا ہے مزروعہ ہی ہو۔ بلکہ لگان ایک وسیع لفظ ہے جس کا اطلاق کانوں' چراگاہوں اور حقوق آب پاشی وغیرہ کی صورت میں بھی ہوتا ہے ۔

اس مقام پر تم قدرتاً یہ سوال کرو گے کہ لگان کی مقدار کس طرح متعین ہوتی ہے ۔ یا وہ کون سے اسباب ہیں جو اس مقدار کی تعیین میں اثر رکھتے ہیں ؟ تم اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں پڑھ آئے ہو کہ قانون طلب و رسد ایک ایسا اقتصادی قانون ہے جس کے عمل سے ہر شے کی قیمت متعین ہوتی ہے ۔ لگان کی مقدار بھی اس وسیع قانون کے عمل سے آزاد نہیں ہے ۔ البتہ بعض ممالک میں اختلاف حالات کے سبب سے اس قانون کا عمل کامل طور پر نہیں ہو سکتا ۔ ریاستہائے[5] متحدہ امریکہ میں اور علیٰ ہٰذا القیاس کینیڈا اور اسٹریلیا میں چونکہ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ایک بلا قید اور آزاد مقابلہ ہے' اس واسطے وہاں کے لگان اسی قانون کے عمل سے متعین ہوتے ہیں ۔ انگلستان میں چونکہ کاشتکاروں کے ساتھ بسا اوقات ہمدردی کی جاتی ہے' اس واسطے قانون مذکور پورے طور پر اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زمیندار کاشتکاروں کو کئی طرح کی رعایات دیدینے کے باعث اقتصادی معنوں میں پوری مقدار لگان کی حاصل نہیں کر سکتے ۔ آئرلینڈ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے قومی اور مذہبی اختلافات اور کاشتکاروں کی آبادی کے بڑھ جانے کے باعث مقابلہ کی کوئی انتہا نہیں رہی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بے چارے کاشتکار اندازے سے زیادہ لگان ادا کرنے پر مجبور ہو جانے کے سبب سے ہمیشہ زمینداروں کے مقروض رہتے ہیں' اور روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں ۔ ہندوستان میں مزارعین کے کئی اقسام ہیں' یعنی

---

[3] یہاں ''کے'' رہ گیا ہے جس کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ (مرتب)

[4] ''دیہات'' کو سب جگہ ''دھات'' لکھا گیا تھا جو غالباً کتابت کی غلطی تھی ۔ اسے درست کر کے '' دیہات'' کر دیا گیا ہے ۔ (مرتب)

[5] یہاں اصل نسخے میں ''صوبجات'' تھا ۔ (مرتب)

تابع مرضی میعادی یا غیر میعادی اور مزارعین موروثی جن کو اس زمین پر جس کو وہ کاشت کرتے ہیں ایک خاص قسم کا حق ملکیت حاصل ہوتا ہے ۔ مقدم الذکر مزارعین کی صورت میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لگان کی تعیین قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے، مگر موخرالذکر قسم کے مزارعین کے لگان کی مقدار قانوناً مقرر ہے اور بعض خاص صورتوں کے سوائے اس مقرر مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی ۔ نظری لحاظ سے ہندوستان میں سرکار خود زمیندار ہے اور ہمیشہ اس امر میں ساعی رہتی ہے کہ مزارعین کی حقیت اراضی ہر طرح سے محفوظ ہو ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ زمین کی قیمت اور اس کے لگان کے درمیان ایک ضروری تعلق ہے ۔ زمین کی قیمت صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس سے لگان ملتا ہے۔ اگر لگان نہ ہوتا تو قیمت بھی نہ ہوتی۔ لیکن اگرچہ یہ تعلق بڑا ضروری ہے بلکہ ایک طرح سے وہی تعلق ہے جو علت و معلول کے درمیان ہوتا ہے، تاہم قیمت زمین اور لگان کی درمیانی نسبت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے ۔ بعض ممالک میں جہاں سرمائے کی مقدار بہت ہے اور انسانی حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں، اور زمین کی ملکیت سے ایک تمدنی امتیاز حاصل ہوتا ہے، وہاں زمین کی قیمت اس کے سالانہ لگان سے بیس پچیس بلکہ تیس گنا بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان ممالک میں خریدار زمین کو صرف لگان ہی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ وہ اعزاز و امتیاز بھی اس کے مدنظر ہوتا ہے جو خرید زمین کا ضروری نتیجہ ہوا کرتا ہے ۔

لگان کے متعلق ایک اور ضروری مسئلہ یاد رکھنا بھی لازم ہے، اور وہ یہ ہے کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر لگان معاف کر دئیے جائیں تو زرعی پیداوار کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا ۔ اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں ہم دو اقتصادی اصول بیان کر آئے ہیں :-

(۱) ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوا کرتی ہے ۔

(۲) کسی شے کی معمولی قیمت اس شے کی رسد کے اس حصے کے مصارف پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔

ان ہر دو اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر مندرجہ بالا مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمھیں معلوم ہے کہ انگلستان کو جس قدر غلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سارے کا سارا انگلستان کی زمینوں میں ہی پیدا نہیں کیا جاتا، بلکہ بعیدالمقام ممالک سے لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کو اخراجات انتقال باربرداری کے علاوہ اس غلے کے مصارف پیدائش بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ پس ہر دو مندرجہ بالا اصول کے رو سے ضرور ہے کہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے برابر ہو جو دیگر مقامات سے لایا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی شے کی دو مختلف قیمتیں نہیں ہو سکتیں۔ بشرطیکہ ان کے خواص میں کوئی نمایاں فرق نہو۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو شخص انگلستان میں ان غیر ممالک کی نسبت جو انگلستان کو غلہ مہیا کرتے ہیں کم مصارف پر غلہ پیدا کر سکتا ہے، وہ فائدے میں رہتا ہے۔ کیونکہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے مساوی ہوگی جو دیگر ممالک سے لایا جاتا ہے۔ یہ فائدہ یا تو مالک زمین کا حق ہے، یا کاشتکار کا۔ محنتی اور خریدار غلہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ فرضاً اگر کوئی مالک زمین نصف لگان معاف کر دے تو اس کا مزارع یا کاشتکار غلے کو کم قیمت پر فروخت نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ غلہ مذکور کو قیمت متعارف پر فروخت کر سکتے ہیں۔ مزید براں یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ مزارع مذکور اپنے کھیتوں کے مزدوروں کو زیادہ اجرت ادا کریں، کیونکہ اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ مزدور مذکور اپنی پہلی اجرت کے عوض کام کرنے پر رضا مند نہ ہوں گے۔ پس لگان پیداوار کا وہ حصہ ہے جو زرخیزی کے لحاظ سے ادنیٰ ترین

زمین کے اخراجات زراعت نکال کر باقی رهتا هے ۔ اس کا تعلق صرف زمیندار اور کاشتکار سے هے اور کسی کو اس سے کچھ واسطه نہیں هے ۔ ممکن هے که زمیندار اپنا لگان مزارع کو دیدے مگر اس صورت میں یه کاشتکار یعنی مزارع اسے اپنے قبضے میں رکھے گا' اور اسے قیمت متعارف پر فروخت کرنے سے خود فائده آٹھائے گا ۔ جب وه اسے قیمت متعارف پر فروخت کرکے خود فائده آٹھا سکتا هے تو کوئی وجه نہیں هے که وه اپنے کھیت کے مزدوروں کو زیاده اجرت دے کر یا لگان مذکور کو کم قیمت پر فروخت کرکے عام دستکاروں یا غلے کے خریداروں کو فائده پہنچائے ۔

هم معلوم کر چکے هیں که جائداد شخصی کی صورت میں لگان خود بخود پیدا هوتا هے' اور نیز ایک خاص اصول هے جسکے رو سے اس کی مقدار متعین هوتی هے ۔ همیں یه بھی معلوم هو چکا هے که لگان جائداد شخصی کی صورت میں مالک زمین کا حق هے اور مزارع کو صرف اسی صورت میں مل سکتا هے که مالک زمین اپنی مرضی سے اسکو عطا کردے ۔ علیٰ هٰذاالقیاس قوانین اقتصاد کے رو سے مزارع' مزدور اور خریدار غله کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں هے جب تک مزارع اپنی مرضی سے انکو عطا نه کرے ۔ مزید براں یه امر بھی ظاهر هے که جوں جوں آبادی بڑھتی هے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی هے جو اس سے پہلے غیر مزروعه پڑی تھیں ۔ جس کا نتیجه یه هوتا هے که جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں اُن کا لگان بڑھ جاتا هے ۔ زمیندار روز بروز دولت مند هوتے جاتے هیں ۔ حالانکه یه مزید دولت جو ان کو ملتی هے نه انکی ذاتی کوششوں اور نه ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجه هوتی هے ۔ بلکه صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا هوتی هے ۔ انکی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ پھر انکا کوئی حق نہیں که وه دولت مند هوتے جائیں ۔ کوئی وجه نہیں که آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائده پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رهے ۔ اگر یه

فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی۔ لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں۔ تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے۔ ان نتائج کو ملحوظ رکھکر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے' جسکا وجود قومی بہبودی کے لئے انتہا درجے کا مضرت رسان ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہئے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے سرکار یاقوم کا حق ہے' نہ کہ زمینداروں کا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ بحث ہے۔ لیکن چونکہ یہ ابتدائی کتاب اس کے لئے موزون نہیں اسواسطے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

باب دوم

ساھوکار کا حصہ یا سود

حصہ دوم میں معلوم ھو چکا ھے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ھے۔ اور زمین کے فطری قویٰ' ھوا' پانی' وغیرہ اس میں داخل نہیں ۔ ظاھر ھے کہ دولت کی پیداوار کا کچھ حصہ یا بہت زیادہ حصہ دستکاروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ضروریات پر صرف ھوتا ھے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ پیداوار دولت کی تمام و کمال مقدار اسیطرح صرف نہ ھو جائے' جب تک کہ کوئی ایسی چیز نہو جو دولت کو جذبات نفسانی کے نتیجہ سے چھوڑا کر کسی قوم کے افراد کو جمع کرنے کی ترغیب و تحریص دے ۔ مہذب ممالک میں تجارت کی وسعت کے ساتھ جمع کرنے کی خواھش کو بہت تحریک ھوتی ھے ۔ کیونکہ ھر شخص یہ چاھتا ھے کہ میرے پاس سرمایہ ھو۔ جسکو خود کسی کام پر لگا کر نفع آٹھاؤں ' یا کسی اور کو مستعار دیکر اس کے معاوضے میں سود لوں ۔ یہ نفع یا سود جو استعمال سرمایہ کے عوض میں ادا کیا جاتا ھے جمع کرنے کا ایک زبردست محرک ھے۔ تا ھم اقوام دنیا کے مختلف افراد پر اس کا اثر مختلف ھوتا ھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ھے کہ سود زر نقد یا روپے کے استعمال کے عوض میں ادا کیا جاتا ھے۔ مگر حقیقت میں یہ صحیح نہیں ۔ کیونکہ اصل مطلب زر نقد نہیں ھے بلکہ وہ اشیاء ھیں جو زر نقد مستعار کی وساطت سے حاصل کی جاتی ھیں اور جنکو بطور سرمایہ استعمال کیا جاتا ھے۔ مزید براں زمانہ' حال میں تجارت کے اکثر کاروبار ساکھ یا اعتبار کے بل پر چلتے ھیں ۔ اس واسطے خرید و فروخت میں زر

نقد کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ پس سود استعمال زر نقد کے عوض میں نہیں بلکہ استعمال سرمایہ کے معاوضے میں ادا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسکی مستقل شرح اس نسبت پر منحصر ہے جو کسی ملک میں قرضوں کی مانگ اور سرمائے کی اس مقدار کے درمیان ہو جو سود پر دی جا سکتی ہو۔ شرح سود کی زیادتی کمی سرمایہ پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کی کمی زیادتی سرمایہ پر۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرح سود کی زیادتی اقتصادی لحاظ سے غیر مفید نہیں۔ کیونکہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور شرح سود اس بچت کا انعام ہے۔ لہٰذا جس قدر شرح سود زیادہ ہوگی اسی قدر لوگوں کو جمع کرنے کی تحریک ہوگی' اور سرمائے کی مقدار بڑھتی جائیگی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ایسے قوانین کا وضع ہونا جن کا منشا شرح سود کو کم کرنا یا اسکی زیادتی کو روکنا ہو' گویا ان اسباب کے عمل کو روکنا ہے' جن کی وساطت سے سرمائے کی رسد بڑھتی ہے۔ مگر برعکس اس کے یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ملک میں شرح سود کی کمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہاں کی تمدنی حالت ہر طرح سے محمود ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شرح سود کی کمی سرمائے کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ سرمائے کی مقدار اس سرعت اور تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے کہ اب اس کے بارآور استعمال کی کوئی مزید صورت رہی ہی نہیں۔ اور نظام تمدن کا شیرازہ ایسا بگڑ گیا ہے اور لوگ اس قدر کاہل و آرام طلب ہوگئے ہیں کہ نئے نئے تجارتی اور صنعتی مشاغل کا بار اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے۔

شرح سود کی زیادتی کے کئی اسباب ہیں۔ لوگ ممالک غیر میں اپنا سرمایہ سود پر نہیں دیتے جب تک کہ زیادہ شرح سود نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں شرح سود کی مقدار مساوی نہیں ہوتی۔ مزید براں شرح سود کی مقدار اس منافع پر بھی انحصار رکھتی ہے جو سرمائے کے استعمال سے حاصل ہو۔ ملک اسٹریلیا کے کسانوں کو زراعت سے بیس فی صدی منافع حاصل ہوتا ہے۔ اسواسطے وہ لوگ سرمایہ مستعار کے عوض میں شرح سود کی

ایک بہت زیادہ مقدار دے سکتے ہیں، بہ نسبت ان ممالک کے جہاں زراعت سے اس قدر منافع حاصل نہیں ہوتا ۔ علیٰ ہٰذالقیاس اشیاء خوردنی کی ارزانی مصارف محنت کو کم کر کے منافع کی مقدار کو زیادہ کرتی ہے، جس سے شرح سود کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔ برخلاف اس کے سونے چاندی کی نئی نئی کانوں کا دریافت ہو جانا سرمائے کی رسد کو زیادہ کرتا ہے۔ اس واسطے شرح سود کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ اور نیز کسی ملک کے مختلف بنکوں کا باہمی مقابلہ بھی جو ہمیشہ اپنے اپنے سرمائے کو لگانے کی فکر میں رہتے ہیں، شرح سود کی مقدار کو کم کرتا ہے۔ زمانہ حال میں مندرجہ ذیل اسباب کے اثر سے شرح سود زیادہ ہوتی گئی ہے۔

(۱) وسائل آمد و رفت کی سہولت سے لوگوں کو غیر ممالک میں سرمایہ منتقل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جس ملک سے سرمایہ منتقل ہو وہاں اس کی رسد کم ہوتی جائے گی ۔ لہٰذا اس ملک میں شرح سود بڑھے گی ۔

(۲) مختلف ممالک کے ارکان سلطنت اخراجات جنگ اور دیگر رفاہ عام کے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کے لئے رعایا سے قرض اٹھاتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سرمائے کی مقدار ملک میں عام طور پر مستعار دی جا سکتی جس سے شرح سود کی مقدار بہ سبب زیادتی رسد سرمایہ کم ہو جاتی ۔

(۳) دیگر ممالک سے اشیاء خوردنی وغیرہ کا خرید کرنا کسی ملک کے سرمائے کی مقدار کو کم کرتا ہے جس سے اس ملک میں شرح سود کی مقدار بڑھ جاتی ہے ۔

(۴) چونکہ مشترک سرمائے والی کمپنیاں[1] قانوناً جائز تصور کی گئی ہیں، اسواسطے ساہوکاروں میں سے اکثر لوگوں نے متفق ہو کر تجارتی کمپنیاں قائم کر لی ہیں ۔ لہٰذا سرمائے کی وہ مقدار جو پہلے سود پر اوروں کو دی جا سکتی تھی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگ گئی ہے، جس سے اس سرمائے کی مقدار کم ہو گئی ہے جو مستعار دیا جا سکے ۔ لہٰذا شرح سود بڑھ گئی ہے ۔

---

[1] Joint Stock Companies (مرتب)

تم شاید یہ سمجھوگے کہ شرح سود اور لگان دونوں ایک ہی جنس کی نوعیں ہیں ۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جوں جوں آبادی زیادہ ہوتی ہے تہذیب و تمدن ترقی کرتے ہیں اور دولت کی پیداوار بڑھتی ہے توں توں جیسا کہ ہم باب گذشتہ میں کہہ آئے ہیں، لگان کی مقدار بڑھتی جاتی ہے ۔ لیکن شرح سود ان حالات میں بوجہ افزائش سرمایہ کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے ۔ علیٰ ہٰذاالقیاس لگان اور سود میں ایک یہ بھی ضروری فرق ہے کہ مقدم الذکر، جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں، اشیاء کی قیمتوں کا کوئی جزو نہیں ہے ۔ لیکن موخرالذکر ان کی قیمتوں کا جزو ہے ۔ کیونکہ شرح سود کی کمی بیشی اس منافع کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے جو تجارت کی کسی شاخ پر سرمایہ لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور منافع کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں کی کمی بیشی پر منحصر ہے ۔

اکثر صورتوں میں ساہوکاروں کو اپنے قرضداروں پر پورا اطمینان نہیں ہوتا ، بلکہ بعض صورتوں میں ان کو سرمائے کی عدم ادائیگی یا کسی اور قسم کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے قرضداروں کو شرح سود کی ایک غیر معمولی مقدار پر سرمایہ قرض دیتے ہیں ۔ اس غیر معمولی شرح سود کو جو احتمال عدم ادائگی یا نقصان کے اندیشے کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہے اصطلاح اقتصاد میں سود کاذب[۲] کہتے ہیں۔ کیونکہ شرح سود کی اصلی اور صحیح مقدار وہی ہے جس کی تعیین میں کسی قسم کے اندیشہ و نقصان کو دخل نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک تجارتی مرکز میں شرح سود کی مقدار کہیں کچھ اور کہیں کچھ ہوتی ہے ۔ قیمت اشیاء کے متعلق تم ایک اقتصادی اصول پڑھ چکے ہو کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اصول شرح سود یا بالفاظ دیگر اس قیمت کے متعلق

---

[۲] مصنف نے ''سود کاذب'' کے الفاظ ''سود خام'' (Gross Interest) کے لئے استعمال کئے ہیں ۔ (مرتب)

صحیح نہیں ہے جو استعمال سرمائے کے عوض میں دی جاتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ شرح سود کی تعیین میں بسا اوقات احتمال نقصان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے ۔ جہاں روپے کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو وہاں ساہوکار زیادہ شرح سود لے لیتے ہیں۔ اور جہاں نقصان کا احتمال کم ہو یا بالکل نہ ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جہاں ان کو روپے کے واپس مل جانے اور سود کے باقاعدہ ادا ہوتے رہنے کا پورا یقین ہو، وہاں کم شرح سود پر رضامند ہو جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ چونکہ لوگ بالعموم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ دنیا میں ان کا بھرم نہ نکل جائے، اس واسطے حتی المقدور مستعار سرمایہ لینے کو اوروں سے چھپاتے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ مختلف ساہوکاروں کے درمیان ایک قسم کی تجارتی ضد یا مقابلہ پیدا کر دیں جس سے شرح سود کی مقدار کم ہو جائے اور ان کو فائدہ پہنچے ۔ لہٰذا مستعار سرمایہ لینے والوں کو حالات کا پورا علم نہیں ہوتا اور ساہوکاروں کے درمیان باہمی مقابلہ کامل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ساہوکار شرح سود کی مختلف مقداروں پر روپیہ قرض دیتے ہیں ۔

علیٰ ہٰذاالقیاس دنیا کی مختلف تجارت گاہوں میں بھی شرح سود کے اختلاف کے اسباب یہی ہیں جو بیان ہوئے ۔ مگر اس خاص صورت میں اختلاف کا ایک اور باعث بھی ہے، یعنی ساہوکار عموماً اپنا سرمایہ غیر ممالک کے لوگوں کو مستعار نہیں دیتے جس سے شرح سود میں مقامی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اور باتوں کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر کسی سبب سے سرمایہ مستعار کی وصولی وغیرہ کے لئے عدالت تک نوبت پہنچی تو اجنبیوں کے ساتھ جھگڑا رگڑا کرنے میں خواہ مخواہ کی دقت ہو گی ۔ بسا اوقات اقوام کا باہمی تعصب اور بدظنی اور قابل اعتماد دلالوں کا دستیاب نہ ہو سکنا بھی ساہوکار کو غیر ممالک میں روپیہ لگانے سے روکتا ہے ۔ مزید براں ان کو فطرتاً یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں شرح سود کی تھوڑی سی مقدار پر اکتفا کرنا اچھا ہے۔ بجائے اس کے کہ سرمایہ دیگرممالک میں منتقل کریں، جہاں کے حالات کا کافی علم نہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا احتمال ہے ۔

باب سوم

مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع

پیداوار دولت کا تیسرا حصہ دار مالک یا کارخانہ دار ہے جو صنعت کی مختلف شاخوں کو مرتب و منظم کرتا ہے اور جس کا فرض علاوہ دیگر فرائض کے ایک اس امر کا فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے کہ کون کون سی اشیاء کس کس مقدار میں تیار کی جائینگی اور کس قیمت پر فروخت کی جائینگی - ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ تمدن انسانی کے ابتدائی مراحل میں مالک یا کارخانہ دار کا وجود ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن پیدائش دولت کی مختلف صورتوں کا پیچیدہ ہوتے جانا، کلوں کی ایجاد اور تجارت کی وسعت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فرد ایسا بھی ہو جو دست کاری کے کاروان کے لئے قافلہ سالار کا کام دے - اور جس کا ذاتی تجربہ' انتظامی قوت اور تجارت کے نشیب و فراز سے واقف ہونا صنعت کی روز افزوں پیچیدگیوں کو سلجھاتا رہے - تم جانتے ہو تمدن کی اعلیٰ صورتوں میں جب کہ صنعت انتہا درجے کی ترقی کر جاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ موجود ہو مالک یا کارخانہ دار کا کام بھی دے سکے - کیونکہ کارخانہ داری کے لئے دیگر اوصاف کے علاوہ ایک خاص قسم کی انتظامی قوت ، عاقبت بینی اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکنے کی قابلیت لازم ہے - جس سے بالعموم ہر سرمایہ دار متصف نہیں ہوتا - لہٰذا جس طرح سرمایہ مہیا کرنے کے عوض میں ساہوکار یا سرمایہ دار کو ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جو شرح سود کہلاتا ہے' اسی طرح پیدائش دولت کے سلسلے میں کارخانہ دار

کو بعض فرائض کی انجام دھی کے لئے ایک خاص معاوضہ ملتا ھے جس کو منافع کہتے ھیں ۔ اکثر محققین اقتصاد نے کارخانہ دار اور سرمایہ دار یا ساھوکار یا یوں کہو کہ منافع اور سود میں کوئی امتیاز نہیں کیا ۔ اس واسطے وہ منافع کو استعمال سرمایہ کا معاوضہ سمجھتے ھیں ۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ کارخانہ دار کو ملتا ھے اسے محض اجرت انتظام و نگرانی وغیرہ تصور کرتے ھیں ۔ لیکن صاف ظاھر ھے کہ پیدائش کے سلسلے میں سرمایہ دار اور کارخانہ دار مختلف اقسام کے فرائض ادا کرتے ھیں۔ اور موخرالذکر کا حصہ ایسا بے حقیقت نہیں ھے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے ۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے اسے اجرت کے نام سے موسوم کرنا ھی غلط ھے ۔ جیسا کہ ابھی واضح ھوگا کہ ھر کارخانہ دار جس میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ھیں سرمایہ دار بھی ھو سکتا ھے۔ کیونکہ اوروں سے کسی خاص شرح سود پر سرمایہ حاصل کر سکتا ھے ۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ تجارتی کاروبار کا زیادہ تر حصہ اعتبار پر چلتا ھے۔ مگر ھر سرمایہ دار یا ساھوکار کارخانہ دار نہیں ھو سکتا۔ کیونکہ وہ اوصاف جو کارخانہ داری کے لئے ضروری ھوتے ھیں ھر سرمایہ دار میں موجود نہیں ھوتے ۔ ھاں اگر کسی سرمایہ دار یا ساھوکار میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ھوں، تو وہ دونوں کے فرائض کو انجام دے کر دگنا فائدہ اٹھا سکتا ھے۔

تم جانتے ھو کسی شے کے مصارف پیدائش سے مراد ان اخراجات کی ھے جو اس شے کی تیاری اور اس کو خرید و فروخت کے مقام وغیرہ پر لانے میں صرف ھوتے ھیں ۔ کارخانہ دار کی خواھش اور امید یہ ھوتی ھے کہ اس شے کی قیمت فروخت یا قدر اس کے مصارف پیدائش سے بڑھ جائے۔ لہٰذا منافع اس فرق کے برابر ھوتا ھے جو کسی شے کی قیمت فروخت اور اس کے مصارف پیدائش کے درمیان ھو۔ بشرطیکہ مقدم الذکر موخرالذکر سے مقدار میں زیادہ ھو ۔ کیوں کہ اگر قیمت فروخت مصارف پیدائش سے کم ھوگی تو اس سے کارخانہ دار کو منافع نہیں ھو گا، بلکہ گھاٹا ھو گا ۔ تجارت اشیا میں یہ نفع جو کارخانہ دار کو ھوتا ھے منافع کہلاتا ھے۔ اور قرضوں کی تجارت کی صورت میں اس نفع کو منافع کے نام سے نہیں بلکہ سود یا مٹی کاٹے کے نام سے

موسوم کرتے ہیں - وسیع معنوں میں منافع کا مفہوم بھی ہے جو بیان ہوا - مگر یاد رکھنا چاہئے کہ منافع کی حقیقت پر بحث کرنے والوں میں سے بعض نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے- جس طرح شرح سود سے مراد ایک خاص مقدار کی ہے جو سرمائے کو ایک خاص مدت تک استعمال کرنے کے عوض میں ادا کی جاتی ہے- اسی طرح شرح منافع سے مراد منافع کی ایک خاص مقدار ہے جو ایک خاص مدت میں حاصل ہو - مگر بعض محققین غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شرح منافع کی تعیین میں مدت کو کوئی دخل نہیں ہے - اور شرح منافع صرف مقادیر منافع اور سرمائے کی درمیانی نسبت پر منحصر ہے - مگر یہ رائے صریحاً غلط ہے - فرضاً اگر میں تجارت کی کسی شاخ پر سو روپیہ سرمایہ لگاؤں اور مجھے پانچ روپیہ یومیہ منافع ہو تو صاف ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ ۱۵۰ روپیہ فی صدی ہے - لیکن اگر اس قدر منافع دو ماہ کی میعاد میں حاصل ہو تو شرح منافع ۷۵ روپیہ فی صدی فی ماہ ہوگی نہ ۱۵۰ فی صدی - لہذا شرح منافع کی مقدار نہ صرف سرمائے کی مقدار پر منحصر ہے بلکہ اس مدت پر بھی انحصار رکھتی ہے جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو - جس قدر کسی شے کی قیمت فروخت اس کے مصارف پیدائش سے زیادہ ہوگی اسی قدر شرح منافع مقدار بھی زیادہ ہو گی - اور جس قدر قیمت فروخت کم ہوگی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو گی - علیٰ ہٰذالقیاس اگر اس مدت کی مقدار جس میں کل منافع حاصل ہوا ہے کم ہو گی تو شرح منافع کی مقدار زیادہ ہوگی - اور اگر مقدم الذکر کی مقدار زیادہ ہو گی تو موخرالذکر کی مقدار کم ہوگی - مثلاً اگر سرمائے کی کسی خاص مقدار کے عوض دو ماہ میں پچاس روپیہ منافع دو' تو شرح منافع فی ماہ پچیس روپیہ ہو گی - لیکن اگر یہ پچاس روپیہ منافع پانچ ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ دس روپیہ ہو گی - لہذا شرح منافع کے متعلق یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ ''شرح منافع مصارف پیدائش اور اس مدت کے ساتھ جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو نسبت معکوس رکھتی ہے،، اس ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں - وہ یہ

سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتی ہے جب کہ اجرت کی مقدار کم ہو۔ اور اسی صورت میں کم ہو سکتی جب کہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکما کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتیوں کے سود و زیان کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے۔ یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے یعنی اگر سرمائے اور منافع کے مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو تو جس مدت میں منافع کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدت کے کم ہو جانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہو جانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے۔ اور اس مدت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہو جاتی ہے۔ خواہ اجرت کی مقدار میں فرق پیدا ہو یا نہ ہو۔ علیٰ ہٰذاالقیاس یہ بھی ممکن ہے کہ اجرت کی مقدار بڑھ جاوے اور منافع کی مقدار کم ہو جائے۔ مگر باوجود اس کے شرح منافع زیادہ ہو جائے۔ مثلاً فرض کرو کہ سرمایہ ایک سو پونڈ کے برابر ہے اور منافع سالانہ بیس پونڈ ہے۔ اگر بیس پونڈ منافع ایک ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع کی مقدار ۲۴۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہوگی۔ فرض کرو کہ شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے سرمایہ دار پانچ پونڈ بطور اجرت ادا کرتا ہے۔ اس صورت میں مصارف پیدائش ۱۰۵ پونڈ ہوئے اور منافع ماہانہ ۱۴۰۳ یا قریباً ۱۵ پونڈ فی صدی ہوا۔ لہٰذا شرح منافع ۱۶۷ پونڈ سالانہ فی صدی سے بھی زیادہ ہوئی۔ لیکن فرض کرو کہ مدت منافع اس سے بھی بڑھ گئی ہے اور منافع کی مقدار بجائے بیس پونڈ فی ماہ کے بیس پونڈ فی یوم ہو گئی۔ یا یوں کہو کہ شرح منافع ۷۳۰۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہے۔ اگر شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے ۱۰ پونڈ بطور اجرت ادا کئے جاویں تو ظاہر ہے کہ ۱۱۰ پونڈ لگانے پر ۱۰ پونڈ یومیہ منافع ہو گا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع فی یوم ۹ فی صدی سے زیادہ یا ۳۳۱۸ سالانہ فی صدی سے زیادہ ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ اس مدت کی کمی سے جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اجرت اور شرح منافع ایک

ساتھ بڑھ سکتے ھیں۔ اگرچہ منافع مجموعی طور پر کم ھی کیوں نہ ھوتا جائے ۔ لہٰذا دستکاروں و خریداروں اور کارخانہ‌داروں کے نفع و نقصان کے درمیان کوئی تناقض نہیں ھے۔ اور شرح منافع مختصراً مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ھے۔

(ا) وہ تمام اسباب جو اشیاء تجارتی کے مصارف پیدائش کو کم کرتے ھیں منافع کی کل مقدار کو زیادہ کرتے ھیں ۔ جس کے یہ معنی ھیں کہ شرح منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ ھوتی ھے ۔ مگر مصارف پیدائش صرف اسی صورت میں کم ھو سکتے ھیں کہ

(۱) دستکار کی کارکردگی بڑھ جائے اور اس کی اجرت بدستور وھی رھے۔

(۲) اجرت کم ھو جائے اگر چہ محنت کی کارکردگی اور اشیاء خوردنی وغیرہ کی قیمت خرید بدستور ھی رھے۔

(۳) اشیاء خوردنی وغیرہ ارزاں ھو جائیں مگر دستکار کو ان کی اس قدر مقدار مل سکے جو پیشتر ملا کرتی تھی ۔ برخلاف اس کے اگر کمی تعلیم یا سرمایہ قائم مثلاً کلوں وغیرہ کے تلف ھوجانے یا دستکار کی جسمانی قوت میں زوال آ جانے کے باعث محنت کی کارکردگی کم ھو جائے، یا دستکار کی اجرت بڑھ جائے، مگر اشیاء خوردنی ارزاں نہ ھوں، یا اجرت بدستور ھی رھے اور اشیاء خوردنی وغیرہ گراں ھو جائیں، تو منافع کی مقدار کم ھوگی ۔ جس کے یہ معنی ھیں کہ شرح منافع کی مقدار بھی اسی نسبت سے کم ھو گی ۔ بشرطیکہ اس مدت میں کوئی تغیر نہ ھو جس میں کل منافع کی مقدار حاصل ھوتی ھے۔

(ب) شرح منافع کی تعین میں چوں کہ مدت کو بھی دخل ھے لہٰذا اگر وہ مدت جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ھوتی ھے، کم ھوجائے تو شرح منافع زیادہ ھو گی ۔

منافع کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصالح جس سے تجارتی اشیاء تیار ہوتی ہیں، مانگ کے بڑھ جانے کی وجہ سے گراں ہو جاتا ہے۔ اور لوگ تجارت کی دیگر شاخوں سے اپنا سرمایہ نکل کر اس شاخ میں لگانا شروع کر دیتے ہیں جہاں شرح منافع نسبتاً زیادہ ہے۔ مگر یہ حالت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ سرمائے کی زیادتی سے اشیاء کی رسد ان کی مانگ سے بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور شرح منافع اپنی پہلی حالت پر عود کر آتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات معمول سے کم بھی ہو جاتی ہے۔

ماہیت منافع کی مزید توضیح کے لئے محقق واکر لکھتا ہے کہ اگرچہ لگان اور سود (ان کا فرق پہلے واضح ہو چکا ہے) میں بڑا فرق ہے، تاہم منافع اور لگان ایک ہی جنس کی دو نوعیں ہیں۔ جس طرح لگان کی مقدار بسبب زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کا کسی خاص مناسب مقام پر واقع ہونا ہے۔ اسی طرح منافع کی مقدار بھی کارخانہ‌دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی انتظامی قوت وعلقبت اندیشی پرانحصار رکھتی ہے۔ علیٰ ھٰذاالقیاس جس طرح مقدم الذکر کی تعیین میں مختلف زمینوں کے لگانوں کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے۔ اسی طرح مختلف کارخانہ‌داروں کے منافع کی مقدار کے معین کرنے میں بھی ان کے اوصاف کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے۔ جسطرح بعض ایسی زمینیں ہیں جو کم لگان ادا کرتی ہیں، اسی طرح بعض ایسے کارخانہ‌دار بھی ہیں جو کم منافع حاصل کرتے ہیں۔ ہر ملک میں سینکڑوں ایسے تاجر یا کارخانہ دار ہیں جو حقیقت میں ان اوصاف سے بے بہرہ ہیں جو کارخانہ داروں کے لئے ضروری ہیں اور جن کا منافع بمشکل ان کے گزارہ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اقتصادی استدلال کے لئے ہم یہ کہہ سکتے کہ اس قسم کے کارخانہ داروں کو منافع کچھ نہیں ہوتا اس توضیح سے حقیقت منافع کے متعلق دو نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں جن کو ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔

(۱) منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ یہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی

---

[1] یہاں اصل نسخہ میں ''اس'' تھا - (مرتب)

غیر معمولی قوت انتظام کی وساطت سے پیدا ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے' بلکہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کے کسی خاص مقام پر واقعہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس استدلال کی بنا پر یہ بات لگان کے متعلق صحیح ثابت کی گئی تھی ' اسی استدلال کی رو سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ صنعتی اشیاء کی قیمت اشیاء مذکور کے اس حصہ کے مصارف پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن چونکہ اقتصادی اصولوں کے رو سے ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک وقت پر ایک ہی ہوتی ہے' لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو کارخانہ دار اُن کارخانہ داروں کی نسبت جو نہایت نامساعد حالات میں کام کرتے ہیں کم مصارف پر اشیاء صنعتی تیار کر سکتے ہیں وہ منافع حاصل کرینگے۔ کیونکہ قیمت اشیاء دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے اور مصارف پیدائش ایک صورت میں کم اور دوسری میں زیادہ ہیں۔

(۲) علیٰ ہٰذاالقیاس یہ صحیح نہیں ہے کہ کارخانہ دار کا منافع صرف اسی صورت میں بڑھ سکتا ہے جبکہ اجرت کم ہو۔ کیونکہ اجرت کی جو مقدار ان کارخانہ‌داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے مزین ہونے کے باعث منافع حاصل کرتے ہیں' وہی مقدار اوروں کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے جو ان اوصاف سے معرا ہونے کے باعث اقتصادی لحاظ سے کوئی منافع حاصل نہیں کرتے' یاصرف برائے نام منافع حاصل کرتے ہیں۔ اجرت کی مقدار دونوں میں مساوی ہے۔ مگر ایک صورت میں منافع ہوتا ہے۔ دوسرے میں کوئی منافع نہیں ہوتا' یا صرف برائے نام منافع ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ حصول منافع کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے۔

جس طرح عمدہ زمینوں کا لگان بری زمینوں کے لگان سے مقدار میں زیادہ ہوتا ہے اس طرح ہشیار اور معاملہ فہم کارخانہ داروں کا منافع ان کارخانہ داروں کے منافع سے زیادہ ہوتا ہے جو اوصاف کارخانہ‌داری سے معرا ہوتے ہیں۔ آبادی و تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادنٰی درجے کی زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں اور زرخیز قطعات زمین کا لگان بڑھتا جاتا ہے۔ علٰی ھٰذاالقیاس جوں جوں ایسے کارخانہ داروں کی تعداد بڑھتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہیں، توں توں ان کارخانہ داروں کا منافع بڑھتا ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔ کیونکہ کارخانہ دار کی ناقابلیت کی وجہ سے مصارف پیدائش بڑھ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی ملک کا تہذیب و تمدن میں ترقی کرنا اس امر کا مقتضی ہے کہ وہاں شرح منافع روز بروز کم ہوتی جانے کا میلان رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ملک میں ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ لٰہذا ان کارخانہ‌داروں کا منافع روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ جو ذاتی قابلیت کا جوہر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے منافع کی زیادتی ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ علاوہ اس کے ایسے ملک میں عام لوگ دور اندیش ہو جاتے ہیں، جس سے سرمایہ زیادہ سے زیادہ جمع ہو جاتا ہے۔ لٰہذا اس کی رسد بڑھتی جاتی ہے اور شرح منافع کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ شرح منافع کی زیادتی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ سرمایہ کی رسد کم ہو۔ مزید براں تہذیب و تمدن کی ترقی سے آبادی بڑھتی ہے۔ جس سے ادنیٰ درجے کی زرخیز زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں۔ لٰہذا مصارف پیدائش اور اشیاء خوردنی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ جس سے شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو جاتی ہے۔ مگر تم کہو گے کہ اگر یہ صحیح ہے تو انگلستان میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ شرح منافع پر کیوں بڑا اثر نہیں ہؤا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ انگلستان کے سرمائے کا بہت سا حصہ غیر ممالک میں لگا ہوا ہے۔ جسکے معنے یہ ہیں کہ خود انگلستان میں سرمائے کی رسد کم ہے۔ انگلستان میں دستکاری کی ترقی اور اشیاء خوردنی کی ارزانی کے باعث جو دیگر ممالک سے

آتی ھیں مصارف محنت کی مقدار زیادہ نہیں ھوتی ' لہٰذا اس ملک میں شرح منافع میں نہایت خفیف کمی واقع ھوئی ھے۔

چونکہ دستکار بالعموم کارخانہ دار کے نفع کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ھیں ۔ اسواسطے بعض محققین اقتصاد دستکاروں کے فائدے کو مدنظر رکھ کر یہ تجویز پیش کرتے ھیں کہ اگر دستکار خود ھی محنتی ھو اور خود ھی کارخانہ دار ھو۔ تو دستکاری کے موجودہ انتظام میں کارخانہ دار کا وجود ضروری نہوگا۔ اور وہ منافع جو موجودہ صورت میں کارخانہ دار کی جیب میں جاتا ھے دستکار کو ملیگا ۔ یہ طریق اصول معاونت کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے جسکا ذکر پہلے ھوچکا ھے۔

باب چہارم

محنتی کا حصہ یا اجرت

پیداوار دولت کا چوتھا حصہ دار دستکار یا محنتی[1] ہے جس کا معاوضہ محنت اجرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم وہ اصول معلوم کریں جس کے عمل پر اجرت کی کمی بیشی کا انحصار ہے دو ضروری امتیاز ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں تا کہ مضمون زیر بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) ظاہری اجرت[2] سے زر نقد کی وہ مقدار مراد ہے جو بطور معاوضہ محنت کے ادا کی جائے۔ مگر حقیقی اجرت[3] سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء تن آسانی وغیرہ کی ہے جو اس زر نقد کی وساطت سے دستکار کو میسر ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ مختلف ممالک اور دستکاری کی مختلف شاخوں میں ظاہری اجرت کے مقادیر مساوی ہوں اور حقیقی اجرت کے مقادیر مندرجہ ذیل اسباب کے عمل سے مختلف ہوں۔

---

[1] جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مصنف نے مزدور (Labourer) کے لئے ''محنتی'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ (مرتب)

[2] Nominal Wages۔ (مرتب)

[3] Real Wages۔ (مرتب)

(ا) مختلف ممالک میں زر نقد کی قوت خرید مختلف ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں ۴ آنہ کے ایک سیر چاول بکتے ہوں، لیکن کسی اور ملک میں اس سکے کے عوض ۲ سیر چاول مل سکتے ہوں۔ لہٰذا اگر دونوں ملکوں میں کسی دستکار کی اجرت ۴ آنہ یومیہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں ۴ آنہ کی قوت خرید زیادہ ہے وہاں کے دستکاروں کی حقیقی اجرت بھی زیادہ ہے، اگر چہ ظاہری اجرت کی مقداریں دونوں ملکوں میں مساوی ہیں۔

(ب) مختلف ممالک میں ادائیگی اجرت کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض مقامات میں دستکار کے مکان کا کرایہ اس کی خورد و نوش کی چیزیں یا مرغزار میں مویشی چرانے یا ایندھن کی کوئی خاص مقدار لے لینے کا حق بھی اس کی ظاہری اجرت پر اضافہ ہوتا ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ دو ملکوں میں کسی خاص قسم کے پیشہ وروں کی ظاہری اجرت مساوی ہو۔ لیکن ان کی ادائیگی اجرت کے مختلف دستور مروج ہونے کی وجہ سے ایک میں حقیقی اجرت کی مقدار زیادہ ہو اور دوسرے میں کم۔ اکثر مغربی ممالک میں خاص خاص پیشہ وروں کو حق اجرت کے علاوہ بعض دیگر حقوق بھی حاصل ہیں، جن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔خصوصاً جب کہ مختلف ممالک کی مقادیر اجرت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو۔

(ج) بعض پیشوں میں دستکار کی بی بی اور اس کے بال بچوں کو بھی ہاتھ بٹانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں بی بی کی کمائی میاں کے مساوی ہو جاتی ہے۔ مثلاً بافندگی میں ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن بڑھئی اور کسان کا پیشہ اس قسم کا ہے کہ بی بی بال بچے ان کے کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔

(د) بعض پیشے قدرتاً اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں دستکار اپنے کام کو بالتواتر جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ان پیشوں میں دیگر پیشوں کی طرح ایسا نہیں ہوتا کہ دستکار کو بالترتیب روز مرہ محنت کرنی پڑے۔ اس عدم تواتر کے کئی وجوہ ہیں۔

(۱) خاص خاص پیشوں کی قدرتی ضروریات ۔

(۲) موسم کا اثر ۔

(۳) بعض تمدنی اسباب ۔

(۴) بعض اسباب جو خود دستکاروں کے طرز عمل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً جب وہ کارخانہ داروں سے زیادہ اجرت لینے کی خاطر کاروبار چھوڑ دیتے ہیں، اور کئی کئی دنوں تک بیکار بیٹھے رہتے ہیں ۔ فن زراعت میں اجرت کی شرح مختلف موسموں میں مختلف ہوتی ہے ۔ بسا اوقات سال کی تیسری سہ ماہی میں پہلی سہ ماہی کی نسبت اجرت کی شرح اول دو اسباب کے عمل سے دگنی ہو جاتی ہے ۔ مگر اس اختلاف کا باعث صرف موسموں کا تغیر ہی نہیں ہے بلکہ فن زراعت کی قدرتی ضروریات بھی کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہیں ۔ مثلاً یہ پیشہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسان بیج بونے کے بعد اس کے اُگنے تک انتظار کریں ۔ علیٰ ہٰذاالقیاس بعض پیشوں میں اختلاف اُجرت صرف اختلاف موسم کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ مثلاً اینٹیں بنانا اور مکانوں پر نقش و نگار کرنا ایسے کام ہیں کہ ان کی ضرورت ہر روز اور ہر موسم میں نہیں پڑتی ۔ ان تمدنی اسباب میں جو مختلف ممالک میں پیشوں کے تواتر محنت پر اپنا اثر کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ بعض ممالک میں بعض تیوہار اور مذہبی رسومات کئی کئی دن تک رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر ممالک میں تیوہار کی تعداد سال میں سو دن سے بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ پس یہ تمام اسباب مختلف ممالک اور مختلف پیشوں میں دستکاری کی حقیقی اجرت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں، خواہ ان کی ظاہری اجرت کی شرح مساوی ہی کیوں نہ ہو ۔

(ر) بعض ممالک اور بعض پیشوں میں دستکار به نسبت دیکر ممالک اور دیگر پیشوں کے زیادہ عمر تک زندہ رہتے ہیں - صاف ظاہر ہے کہ اگر دو دستکار ایک ہی عمر میں اور ظاہری اجرت کی ایک ہی مقدار کے عوض میں بارآور طور پر محنت کرنا شروع کریں تو وہ دستکار جو زیادہ عمر تک زندہ رہیگا حقیقی اجرت کی زیادہ مقدار حاصل کریگا ۔

(۲) دوسرا امتیاز جس کا ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ اجرت یا ظاہری مصارف محنت اور حقیقی مصارف محنت کے درمیان ہے - ظاہری مصارف محنت سے مراد اجرت کی وہ مقدار ہے جو کارخانہ‌داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے' اور اس کی کمی بیشی ضروریات زندگی یا اشیاء تن آسانی وغیرہ کی اس مقدار کی کمی بیشی پر منحصر ہے جو دستکار کو اپنی اجرت کے عوض میں میسر ہو سکے - لیکن حقیقی مصارف محنت کی مقدار اس معاوضے کی مقدار پر منحصر ہے جو کارخانہ داروں کو دستکاروں کے کام پر لگانے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ادائیگی اجرت کے عوض میں ملتی ہے- خواہ ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی مقدار جو وہ اپنے دستکاروں کو ادا کرتا ہے ' کم ہو یا زیادہ ۔

ممکن ہے کہ کارخانہ دار کو ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی ایک بہت بڑی مقدار ادا کرنی پڑے' مگر حقیقی مصارف محنت دستکار کی ہنرمندی اور اس کی محنت کی کار کردگی وغیرہ کی وجہ سے کم ہوں ۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کارخانہ دار اجرت کی ایک ایسی قلیل مقدار ادا کرے جو بمشکل دستکاروں کے گذارے کے لئے کافی ہو ۔ مگر سستی ' غفلت بے ہنری اور بھدا کام کرنے کے باعث ان کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے اجرت کی وہ مقدار بھی کارخانہ دار کے پلے نہ پڑے' جو اس نے ادا کی ہے- کاری گر کفش دوز جو زیادہ اجرت لیتا ہے' چمڑے کی کتر بیونت اس ذکاوت سے کرتا ہے کہ ایک گز کے چار جوڑے بوٹ بنا لیتا ہے ۔ مگر بے ہنر کفش دوز اسی قدر چمڑے کے تین جوڑے بھی مشکل سے بنا سکتا ہے-

لہذا مقدم الذکر کو کام پر لگانے سے کارخانہ دار کو منافع ہوگا اور مؤخرالذکر کو کام پر لگانے سے نقصان - یا یوں کہو کہ پہلی صورت میں کارخانہ دار کے حقیقی مصارف محنت کم ہونگے اور دوسری صورت میں زیادہ - فرض کرو کہ دو کفش دوز ہیں جن میں سے ایک کی یومیہ اجرت ایک روپیہ ہے مگر پہلے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر لاگت ایک روپیہ آتی ہے اس کی کاری گری کی وجہ سے ۴ روپے قیمت پاتا ہے- اور دوسرے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر اس کے کم درجے کا کاری گر ہونے کی وجہ سے ایک روپیہ ۴ آنے لاگت آتی ہے تین روپیہ قیمت پاتا ہے- صاف ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت ادا کرنے کا معاوضہ دستکار کے بھدا کام کرنے کے باعث صرف ۱۲ آنے ہے- ظاہری مصارف محنت دونوں صورتوں میں مساوی ہیں- تاہم پہلی صورت میں دستکار کی ہنر مندی کی وجہ سے حقیقی مصارف کم ہیں اور دوسری صورت میں دستکار کے کم درجہ کا کاری گر ہونے کے باعث زیادہ ہیں - کیونکہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت دینے کا معاوضہ دو روپیہ ملتا ہے' اور دوسری صورت میں صرف ۱۲ آنے - غالباً یہ صحیح ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت پانیوالے دستکار وہی ہوتے ہیں جنکی محنت سے کارخانہ دار کو حقیقی مصارف محنت کی کم سے کم مقدار ادا کرنی پڑے- اسکا ثبوت یہ ہے کہ جب کارخانہ دار اپنے دستکاروں کی تعداد کو کم کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے بالعموم انہیں دستکاروں کو چھٹی دیتے ہیں جنکی اجرت سب سے کم ہو- کیونکہ ان کی محنت سے حقیقی مصارف محنت کی مقدار بڑھتی ہے- اس کے علاوہ جن قوموں میں حقیقی اجرت کی شرح نہایت قلیل ہوتی ہے' بالعموم وہی قومیں اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ دیگر ممالک کی تیار شدہ اشیاء پر جہاں اجرت کی مقدار بہت زیادہ ہے اس قدر محصول لگاویں کہ وہ ان کے ملک میں بک نہ سکیں - ہندوستان میں روئی کاتنے والی کی اجرت بوجہ اس کے بھدا کام کرنے کے ایک روپیہ ۴ آنے فی ہفتہ ہے- مگر انگلستان میں ایسے دستکار کی اجرت بوجہ اس کی کاریگری کے فی ہفتہ پندرہ روپیہ ہے- اسواسطے موخرالذکر ملک میں مقدار اجرت کے زیادہ ہونے کے باعث حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت کم ہے- جس کے یہ معنے ہیں کہ وہاں کے

کارخانہ دار اپنی تیار کردہ اشیاء کو دیگر ممالک میں کم قیمت پر بیچکر بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ انگلستانی کپڑے کی کثیر مقدار آتے رہنے کے باعث ہمارے دیسی کپڑے کی تجارت معدوم ہوگئی ہے- کیونکہ ہمارے ملک میں بہ سبب کمی اجرت حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت زیادہ ہے- جس کے یہ معنے ہیں کہ ہمارے کارخانہ دار انگریزی کارخانہ داروں کی طرح کم قیمت پر کپڑا بیچکر فائدہ نہیں اٹھا سکتے - اسواسطے مجبوراً تجارت کی اس شاخ کو ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں- لہٰذا ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انگلستان کے کپڑے پر محصول لگایا جاوے' تاکہ ہمارے ملک کی اپنی صنعت کو ترقی ہو- انگلستان کا کپڑا نفیس بھی ہوتا ہے اور سستا بھی - اس واسطے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے کپڑے کے سامنے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت چمک سکے' جہاں کے دستکار بھدا کام کرنے والے ہیں' اور جہاں کے کارخانہ داروں کو حقیقی مصارف محنت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی ہے؟

اس توضیح کے بعد ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مقدار اجرت کی کمی بیشی کس بات پر منحصر ہے - اکثر انگریزی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کل سرمائے کا کچھ حصہ ادائیگی اجرت کے لئے علیحدہ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے- جس کی مقدار ہر ملک میں اقتصادی اسباب کے عمل سے قدرتاً معین ہو جاتی ہے- سرمایہ کی یہ معین مقدار سرمایہ اجرت[4] کہلاتی ہے- اور مختلف دستکاروں پر مقابلے کے اثر سے منقسم ہوتی ہے - اگر ایک دستکار کو زیادہ اجرت ملتی ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے کو کم ملے' اور اس واسطے ہر دستکار کی اجرت بحساب اوسط سرمایہ اجرت کی مقدار اور تعداد دستکاروں کی درمیانی نسبت سے متعین ہوتی ہے - یعنی اگر سرمایہ اجرت کی مقدار زیادہ ہے اور دستکاروں کی تعداد کم تو دستکاروں کو زیادہ اجرت ملیگی - اور اگر سرمایہ اجرت کی مقدار کم ہے اور دستکاروں کی تعداد زیادہ

---

[4] مراد ہے Wage Fund — (مرتب)

تو ان کی اجرت کم ہو گی - پس ان حکماء کے نزدیک سرمایہ اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد سے بالکل متاثر نہیں ہوتی - بلکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جو اقتصادی اسباب کے عمل سے ہر ملک میں خود بخود معین ہو جاتی ہے - اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ اگر کسی ملک میں دستکاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے تو سرمایہ اجرت کی مقدار بھی بڑھ جائے - غرض کہ یہ حکما لگان اور اجرت کو نکال کر پیدا وار دولت کے باقی حصے کو اس شخص کا حق قرار دیتے ہیں جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی -

مگر امریکہ کے مشہور محقق و اکر اس مسئلہ کی نہایت زور سے تردید کرتے ہیں اور انگریزی محققین کی تحریروں پر مندرجہ ذیل اعتراض کرتے ہیں -

(۱) یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اجرت ہر حالت میں سرمائے کی مقدار میں سے ادا کی جائے جو کارخانہ دار کے پاس پہلے سے جمع ہو - انگریزی محققین کا یہ مسئلہ صرف انگلستان کے حالات اقتصادی کے مشاہدے کا نتیجہ ہے ' جہاں سرمائے کی بہت سی مقدار پہلے سے جمع تھی اور جہاں دستکاروں کی اجرت گذشتہ سالوں میں اس قدر خفیف رہی ہے کہ ان کو روز مرہ کی ضروریات زندگی کے لئے مجبوراً اپنے کارخانہ دار کا منہ تکنا پڑتا تھا - کیونکہ وہ بہ سبب کم استطاعتی اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت تک انتظار نہ کر سکتے تھے - صوبجات متحدہ امریکہ میں چونکہ دستکاروں کی مالی حالت اچھی ہے اس واسطے کارخانہ دار اشیاء کی فروخت کے بعد اجرت ادا کرتے ہیں - اگرچہ وہاں کے دستکار اپنی اپنی ضروریات کے مطابق فروخت اشیا سے پہلے بھی اپنی اجرت کا کچھ حصہ لے سکتے ہیں -

(۲) اگر کارخانہ دار اپنے دستکاروں کو روز اجرت دے بھی دیا کریں ' تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اجرت کی مقدار سرمایہ اجرت کی مقدار سے معین ہوتی ہے - کیونکہ کارخانہ دار اپنا موجودہ سرمایہ خرچ کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مزید دولت پیدا

کرنے کی غرض سے لگاتا ہے- جس سے اس کو منافع کی توقع ہوتی ہے- یہ دولت جو دستکاروں کی محنت سے پیدا ہوئی ہے زیادہ ہو تو کارخانہ دار مذکور اجرت بھی زیادہ ادا کر سکے گا - اور اگر اس کی مقدار کم ہو تو وہ اپنے نفع کے خیال سے اجرت بھی کم ادا کر سکے گا - لہٰذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیدا وار محنت کی قدر پر منحصر ہے- جس قدر اس کی پیداور محنت کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ جس قدر دستکار اپنی محنت کی کارکردگی اور ہنرمندی کی وجہ سے مزید دولت پیدا کریگا' اسی قدر اس کی اجرت بھی زیادہ ہو گی - پس اجرت حقیقت میں دستکار کی پیدا وار محنت میں سے ادا کی جاتی ہے نہ کہ[5] سرمایہ اجرت میں سے جو کارخانہ دار کے پاس موجود ہو-

(۳) چونکہ دلیل مندرجہ بالا کے مطابق اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیدا وار محنت کی مقدار سے متعین ہوتی ہے اس واسطے ظاہر ہے کہ اگر پیدا وار محنت کی مقدار زیادہ ہوگی تو دستکاروں کی اجرت بھی زیادہ ہوگی- اور اگر اس کی مقدار کم ہوگی تو اجرت بھی کم ہوگی - لہٰذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتی ہے- مثلاً اگر زرعی دستکاروں کی تعداد بڑھ جاوے اور زمین کی کاشت ابھی نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو' تو صاف ظاہر ہے کہ انقسام محنت کی وجہ سے پیدا وار محنت کی مقدار بہت زیادہ ہو جائے گی - (یہ کوئی ضرور نہیں کہ پیدا وار محنت کی مقدار میں اسی نسبت سے زیادتی ہو جس نسبت سے کہ دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہوئی ہے- بلکہ جب زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو - تو دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہو جانے کے باعث انقسام محنت زیادہ مکمل طور پر عمل کرتا ہے- اس واسطے پیدا وار محنت کی

---

[5] یہاں ''کہ'' رہ گیا تھا جو بڑھا دیا گیا ہے — (مرتب)

مقدار اس نسبت سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے) اس صورت میں چونکہ پیداوار محنت کی مقدار بڑھ گئی ہے اس واسطے ممکن ہے کہ دستکاروں کی اجرت بھی بڑھے اور سرمائے کی مقدار میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس اگر زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ دستکاروں کی زیادتی سے پیداوار محنت فی کس کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اجرت فی دستکار بھی کم ہو گی۔ خواہ سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا وجوہ سے محقق موصوف انگریزی حکما کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا، اور اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ ان کے خیال کو صحیح سمجھنا اور یہ تسلیم کر لینا کہ دستکاروں کی اجرت سرمایۂ اجرت میں سے ادا کی جاتی ہے گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ دستکاروں کا ہنر مندی، دیانت داری اور دیگر اوصاف میں ترقی کرنا اگرچہ ان کی پیداوار محنت کو زیادہ کرتا ہے تاہم ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ ان کی اجرت سرمائے کی ایک معین مقدار سے ادا کی جاتی ہے۔ اور اجرت کی کمی بیشی اس مقدار کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ انگریزی حکما یہ سمجھتے ہیں کہ پیداوار دولت میں لگان اور اجرت کو نکال کر باقی جو کچھ بچتا ہے وہ اس شخص کا حق ہے جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی۔ مگر محقق واکر کے نزدیک اجرت کی بحث لگان، سود اور منافع کی بحث کے بعد آتی ہے۔ کیونکہ اجرت پیداوار دولت کی اس مقدار کے برابر ہے جو تینوں مذکورہ حصوں کو نکال کر باقی بچے۔ لگان کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ اور نہ لگان کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ اس واسطے دستکار لگان کے کسی حصے کا حق دار نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس سود چونکہ استعمال سرمایہ کا معاوضہ ہے اور اس کی کمی بیشی ان لوگوں پر اثر کرتی ہے جو دولت کے جمع کرنے والے ہوں۔ لہٰذا دستکار کو بحیثیت دستکار ہونے کے شرح سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ منافع بھی لگان کی

طرح اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ اور نہ اس کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ تینوں حصے، لگان، سود اور منافع، دستکاروں کی اجرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اجرت دستکاراں کا اندازہ لگانے کے لئے پیداوار دولت کی کل مقدار میں سے پہلے ان کو وضع کر لیا جائے۔ اگر اشیاء کی قیمتوں پر ان کا اثر ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ دستکار کی اجرت بھی ان سے متاثر ہوتی۔ کیوں کہ حقیقی اجرت سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء سے ہے جن کو دستکار زر نقد کی وساطت سے خرید کر سکیں۔ مگر چوں کہ اجرت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس واسطے محقق مذکور کے نزدیک تینوں حصوں یعنی لگان، سود اور منافع کو نکال کر دولت کی پیداوار میں سے جو کچھ باقی بچے وہ دستکار کا حق ہے۔ کیوں کہ ہر سبب جو پیداوار محنت کی مقدار کو زیادہ کرتا ہے حقیقت میں دستکار کے حصے کو زیادہ کرتا ہے۔ تم شاید کہو گے کہ پیداوار محنت کی زیادتی سے زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ‌دار کا حصہ کیوں نہیں بڑھتا۔ اس سوال کے جواب کے لئے فرض کرو کہ دستکار اپنے کام میں نسبتاً زیادہ چست اور کاری گر ہو گئے ہیں، جس سے پیداوار محنت کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی ہے اور وہ مصالح بھی کم خرچ ہوتا ہے جس سے اشیاء تجارتی تیار ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے؟ زمیندار کا؟ نہیں۔ ہر گز نہیں۔ کیونکہ اس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی، جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی۔ بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہو گئی ہے۔ لہٰذا مصالح مذکور کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا، جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ علیٰ ہٰذاالقیاس یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے۔ کیونکہ سرمائے کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے، جب کہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ بلکہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصے کو

اُلٹا کم کرتا ہے۔ کیونکہ کاری گر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لئے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بے ہنر دستکار کو۔ کاری گر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مجموعی طور پر سرمائے کی مانگ کو کم کرتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر شرح سود کو کم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ کارخانہ‌داروں کی تعداد میں زیادتی ہو (یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے) اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا کارخانہ‌داروں کی زیادتی تعداد کا مستلزم ہو۔ بلکہ دستکاروں کے ہنر اور کاری گری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے۔ جس سے ناقابل کارخانہ‌داروں کا وجود معطل ہو جاتا ہے۔ اور وہ دائرہ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ کارخانہ‌داروں کی تعداد کم ہوجانے کے باعث ہشیار اور قابل کارخانہ‌داروں کا منافع کم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے، خود دستکاروں کا حق ہے۔ زمینداروں، ساہوکاروں اور کارخانہ‌داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

باب پنجم

مقابلہ دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے

اگرچہ موجودہ تمدن میں دستکار نظری لحاظ سے پیداوار دولت کی اس تمام مقدار کا مالک ہے جو زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ‌دار کا حصہ نکال کر باقی رہتی ہے، تاہم بعض اسباب کے عمل سے دستکاروں کو انتہا درجے کا نقصان پہنچ جاتا ہے، اور وہ اپنا پورا حصہ حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

(۱) بسا اوقات دستکاروں میں شادیوں کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ چند سالوں میں ان کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے۔ جس سے پیداوار محنت کی مقدار فی کس کم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ افزائش آبادی کے باعث روز بروز ادنیٰ درجے کی زمینوں کو مجبوراً کاشت میں لانا پڑتا ہے۔ فرضاً اگر پہلے بیس دستکاروں کی پیداوار محنت چالیس من غلہ ہو، تو ان کا حصہ فی کس دو من ہو گا۔ لیکن اگر دستکاروں کی تعداد چالیس ہو جاوے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا حصہ فی کس صرف ایک من رہ جائے گا۔

(۲) علیٰ ہٰذالقیاس اصول مقابلہ کے کامل طور پر عمل نہ کرنے کے باعث بھی دستکار نقصان اٹھاتے ہیں۔ بالعموم دستکار نقل مکان کی تکلیف گوارا کرکے ایسے مقامات میں جانا نہیں پسند کرتے جہاں شرح اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ بلکہ جس جگہ حالات

نے[1] لا پھینکا وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ تمام اشیاء نقل مکان کر سکتی ہیں، مگر انسان ایک ایسی چیز ہے کہ بڑی مشکل سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرتا ہے۔ البتہ بعض ممالک میں جہاں کے لوگ قدرتاً چست اور اپنی حالت کو سنوارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، دستکار آزادی سے نقل مکان کرتے ہیں۔ جس سے مختلف جگہوں اور مقاموں کے دستکاروں کے درمیان اصول مقابلہ پورے طور پر عمل کرتا ہے۔ اور اجرت کے مقادیر میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ علاوہ بریں دستکار اپنے پیشوں کو تبدیل کرنے سے بھی بالعموم گھبراتے ہیں۔ اس غفلت یا کاہلی کی وجہ سے انہیں بسا اوقات ایسے پیشوں میں روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے جہاں دستکاروں کی مفلسی کے اور اسباب کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ تبدیل پیشہ ایک قسم کا طعن تصور کیا جاتا ہے۔ اگر کسی درزی سے کہو کہ اپنے بیٹے کو کفش دوزی یا آہن گری کا کام سکھلائے، کیوں کہ اس کام میں بوجہ قلت افراد دستکاروں کی اجرت کی مقدار زیادہ ہے، تو اس بات سے وہ گھبراتا ہے اور آہن گری یا کفش دوزی کو اپنی ذات کے خلاف سمجھتا ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے یہ تمدنی نقص اب روز بروز دور ہو رہا ہے۔

اگر مقابلہ ہر طرح سے کامل ہو اور پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثر سے ہر دستکار اپنے ہنر کے مطابق اجرت پائیگا۔ جو شخص جس کام کی قابلیت قدرتاً رکھتا ہوگا۔ وہی کام اس سے لیا جائیگا۔ اور نظام تمدن میں ہر فرد کے فرائض وہی ہونگے جو ہونے چاہئیں۔ دستکاروں کی حالت میں ایک قسم کی مساوات قائم ہو جائیگی

---

[1] یہاں اصل نسخے میں ''نے'' اور ''لا'' کے درمیان ''ایک جگہ'' لکھا تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

اور وہ تمام نقصان جو مقابلہ ناکامل * کی صورت میں دستکاروں کو پہنچتے تھے - دور ہو جائینگے - ہم پہلے اشارۃً بیان کر آئے ہیں کہ مقابلے سے مراد اس تجارتی رقابت کی ہے جو انسان کی فطری خود غرضی کی وجہ سے کسی شے کے خریدنے اور بیچنے والوں کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ناگوار سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کشش ثقل کی وجہ سے اجرام فلکی کے درمیان ایک قسم کا نظام قائم ہے' اسی طرح مقابلہ بھی ایک قسم کی کشش ہے' جس کے عمل سے صنعت و حرفت کے عالم میں نظام قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اسی شاخ میں کام کریگا جہاں اسے اجرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملتی ہے' تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اسکا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود ہے۔ بلکہ اگر دوسرے پہلو سے دیکھو تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اس شاخ میں پہنچ جائیگا جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ اگر تجارت کی کسی ایک شاخ میں کام کرنے سے کسی دستکار کی تیار کردہ شے بہ نسبت دیگر شاخوں کے زیادہ قیمت پاتی ہے' تو صاف ظاہر ہے کہ تجارت کی اس خاص شاخ میں بہ نسبت دیگر شاخوں کے اس دستکار کی مانگ زیادہ ہے۔ اگر وہ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ میں چلا جاوے' تو نہ صرف نقصان اٹھائیگا بلکہ اس کی حرکت سے اوروں کو بھی نقصان پہنچیگا۔ علاوہ بریں مقابلہ کامل کے عمل سے قدرتی اور دیگر حوادث (مثلاً قومی سرمایہ کا عظیم الشان جنگوں میں صرف ہو جانا' فصل نہ ہونا' آتش زدگی' طوفان' وغیرہ) کا اثر دستکاروں پر مساوی طور پر منقسم ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مقابلہ کامل دستکار کا محافظ ہے۔ اور ان کو بحیثیت مجموعی اس بربادی اور تباہی سے بچاتا ہے جو اس قسم کے حوادث کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ تم جو کے ایک ڈھیر پر زور سے ایک پتھر مارتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم اس صدمہ سے جو کے ایک منفرد دانے کو بھی نہیں کچل سکتے - کیونکہ دانے ادھر اُدھر ہو جائینگے اور پتھر ڈھیر کے اندر گھس

---

* Imperfect Competition (مرتب)

جائیگا - برخلاف اس کے اگر تم ڈھیر میں سے ایک جو کو لیکر اس کے اوپر پتھر مارو، تو یہ دانہ ریزہ ریزہ ہو جائیگا - یہی سوال دستکاروں کا ہے - اگر ڈھیر کے دانوں کی طرح ان کی حرکت بھی آزاد نہ ہو اور یہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک پیشہ سے دوسرے پیشہ میں بلا قید منتقل ہو سکتے ہوں، تو حوادث کا اثر چونکہ سب پر مساوی تقسیم ہو جائیگا، اس واسطے کسی فرد واحد کو چنداں محسوس نہ ہو گا - اور سب کے سب افراد محفوظ رہینگے - اور مزید براں ایسے اسباب فی‌الفور اپنا عمل شروع کر دینگے جنکے اثر سے وہ کمی پوری ہو جائیگی جو ان ناگہانی حوادث سے پیدا ہوئی ہو - غرض کہ مقابلہ کامل اور دیگر اقتصادی اسباب کا عمل دستکاروں کی تمدنی حیثیات کے درمیان ایک قسم کی ایسی مساوات اور ایک طرح کی ایسی یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے جس کے ساتھ تجارت کی ہر شاخ کی ترقی اور توسیع وابستہ ہے -

لیکن چونکہ نفس الامر میں ایک قسم کا کامل مقابلہ کسی ملک کے دستکاروں کے درمیان نہیں ہے، اس واسطے نظام تمدن کی موجودہ صورت میں دستکاروں کی حالت بالعموم اچھی نہیں ہے - موجودہ ناکامل حالت اس امر کی متقضی ہے کہ اقتصادی اسباب کا اثر دستکاروں کا موید نہ ہو، بلکہ مخالف ہو - جو مصیبت کا مارا زندگی کی دوڑ میں ایک دفعہ منہ کے بل گر گیاوہ پھر اٹھ نہیں سکتا - اور موجودہ حالت میں ایسے اسباب بھی موجود نہیں جنکا عمل اس بد قسمت کو سہارا دیکر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے - جب کوئی دستکار بے روزگار ہو کر مفلس ہو جاتا ہے تو بالعموم[3] فطری خودداری اور ہم چشموں کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی آرزو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتی - جو قدرتاً انسان کو اوروں سے آگے بڑھ جانے کی ایک زبردست تحریک دیتی ہے - مفلسی کا آزار انسان کی روحانی قویٰ کا دشمن ہے - اور وہ مایوسی، فکر اور غفلت شعاری، کاہلی اور ہلاکت کی اور صورتیں جو اس بلائے بے درمان کے ساتھ آتی ہیں دستکار

---

[3] یہاں نسخہ میں ''بالعموم'' کے بعد لفظ ''وہ'' تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے - (مرتب)

کی ذاتی قابلیت اور اس کی محنت کی کار کردگی پر ایسا برا اثر کرتی ہیں کہ اس کے کام کی وہ کیفیت اور کمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کی شکست بیچارے دستکار کو ہمیشہ کے لئے کار زار زندگی کے ناقابل کر دیتی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ اس شکست کا کچھ علاج ہو جائے بلکہ جدید اقتصادی اسباب کا عمل (مثلاً تجارت کی توسیع، محنت کی نئی شاخوں کا کھلنا اور ملک کی روز افزوں اقبال مندی) اس بیچارے کی حالت کو سدھار نہیں سکتا۔ لہٰذا موجودہ مقابلہ ناکامل کی صورت میں اقتصادی اسباب کا عمل اس طرف میلان رکھتا ہے کہ نظام صنعت میں افراد کا موجودہ اختلاف مدارج روز بروز بڑھتا جائے، اور جس فرد یا جماعت کو کسی سبب سے آغاز ہی میں کوئی مصیبت دامن گیر ہو گئی اس کی حالت بدستور وہی رہے، بلکہ روز بروز ابتر ہوتی جائے۔ تمدن کی ایسی حالت میں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر نظام صنعت مقابلۂ کامل کی برکات سے خالی ہو تو اجرت کی مقدار کو بڑھانے اور دستکار کی تمدنی حالت کو سنوارنے کے واسطے کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیں؟

حکما کا ایک طبقہ جس کو حکمائے متوکلین کے نام سے موسوم کرنا چاہئے، کہتا ہے کہ موجودہ نظام صنعت میں قوانین وغیرہ کی مدد سے کوئی دست اندازی نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ اس کو تمام قانونی اور دیگر قیود سے آزاد کر کے اس بات پر اعتماد کرنا چاہئے کہ بالآخر جو کچھ ہوگا نوع انسان کے لئے اچھا ہوگا۔ یہ حکماء اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قانون کی مدد سے دستکاروں کی اجرت کا زیادہ کرنا برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کے ارکان سلطنت نے یہ قانون وضع کیا ہے کہ اجرت کی مقدار بیس فی صدی کے حساب سے زیادہ کر دینی چاہئے۔ اگر پیداوار محنت کی مقدار میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی تو صاف ظاہر ہے کہ کارخانہ داروں کو نقصان پہنچے گا، اور وہ اپنا سرمایہ دیگر ممالک میں لگا دیں گے، جہاں اس قسم کا کوئی قانون مروج نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر سرکار یہ قانون وضع کر دے کہ ہر دستکار آٹھ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہ

کرے گا تو ایک صریح نا انصافی ہو گی۔ کیونکہ بعض پیشوں میں آٹھ گھنٹہ کام کرنا کوئی بات نہیں۔ مگر بعض پیشوں میں اتنے گھنٹہ یومیہ کام کرنا جسمانی صحت کے بالکل مخالف ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بے روز گار دستکار کا حق ہے کہ سرکار اُسے روزگار دے۔ بالفرض اگر ایسا ہو تو سرکار کو تنخواہ یا اجرت کی ادائیگی کے واسطے رعایا سے قرض اٹھانا پڑے گا اور مداخل ملکی میں کسی نہ کسی طرح زیادتی کرنی ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لئے یہ طریق عمل مفید ہوگا۔ مگر اس کو مستقل طور پر اختیار کرنا انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ کیونکہ آبادی کی روز افزوں ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک تمام قانونی قیود محض بے سود ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حقیقی آزادی قیود کے دور کرنے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بعض قیود ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان کی آزادی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی تماشا گاہ میں آگ لگ جائے اور ہر شخص اپنے بچاؤ کے لئے وہاں سے بھاگے تو صاف ظاہر ہے کہ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگنے کی نسبت اگر تماشائی کسی خاص ترتیب کے پابند ہو کر وہاں سے نکلیں تو یہ طریق عمل زیادہ محفوظ ہو گا۔ علیٰ ھٰذا القیاس ہر قسم کے انتقال زمین کے لئے ایک خاص تحریر اور پھر اس تحریر میں خاص خاص قانونی اصطلاحوں کا استعمال ضروری ہے۔ جو بظاہر ایک قسم کی قید ہے۔ مگر حقیقت میں آزادی انتقال کو زیادہ کرتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کی قیود سے انتقال کنندہ کو ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور[4] کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہتا۔ جس کا بصورت عدم تحریر وغیرہ اس کے دل میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ لہٰذا دستکاروں کی حالت کو سنوارنے کا سب سے احسن طریق یہ ہے کہ دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ہمدردی پیدا کی جائے۔ اور یہ بات ان کے ذہن نشین کی جائے کہ قوم کی بہبودی تمام افراد کی بہبودی سے وابستہ ہے۔ اور ایک رشتے کے ضعیف اور کمزور ہو جانے سے تمام قوم کا شیرازہ بگڑ

---

[4] یہاں اصل نسخے میں ''اور'' کے بعد لفظ ''کوئی'' تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

جانے کا اندیشہ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک طریق معاونت پر عمل کرنا بھی دستکاروں کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ اس طریق سے وہ منافع جو کارخانہ داروں کی جیب میں جاتا ہے، دستکاروں کے قبضے میں آتا ہے۔

علیٰ ھذا القیاس دیگر ممالک میں جا کر آباد ہونا بھی دستکاروں کی بہبودی پر ایک نمایاں اثر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی وساطت سے کسی ایک ملک میں ان کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں سے قریباً بارہ لاکھ دستکار اس وقت جزائر میں آباد ہیں، جہاں ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ لیکن ابھی ہندوستان کے دستکاروں کو نقل مکان کی بہت ضرورت ہے۔ مگر ہمارے نزدیک کمی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر، اس کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے، اس کے اخلاق سنورتے ہیں، اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے۔ اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے۔ اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے، جو بالعموم جہالت اور نا عاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

باب ششم

سرکار کا حصہ یا مالگزاری

پیداوار دولت کی کچھ مقدار ایسی بھی ہے جو نہ زمیندار اور ساہوکار کے قبضے میں جاتی ہے، نہ کارخانہ دار اور دستکار کے قبضے میں۔ یہ مقدار دو حصوں پر منقسم کی گئی ہے۔

(۱) اول وہ مقدار جو محصولات و مالگذاری کی صورت میں سرکاری خزانوں میں جاتی ہے۔ حکماء کے درمیان اس امر کے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ آیا محصول سرکار کی بحث تقسیم دولت کے باب میں آنی چاہئے یا صرف دولت کے باب میں۔ کیا سرکار کو پیداوار دولت کا پانچواں حصہ دار تصور کرنا چاہئے یا صرف یہ سمجھنا چاہئے کہ زمیندار، ساہوکار، کارخانہدار اور دستکار کے حصوں میں سے کچھ مقدار انتظام مملکت کے استحکام کے لئے سرکار کو ادا کی جاتی ہے۔ بعض حکماء کا یہ قول ہے کہ سرکار خود دولت پیدا کرتی ہے، مثلاً سڑکیں بنواتی ہے، پل تیار کرواتی ہے، اور دیگر رفاہ عام کی صورتوں میں سرمایہ صرف کرتی ہے۔ لہٰذا تقسیم دولت میں ایک خاص حصے کی حقدار ہے جو محصول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض حکماء اس بات پر مصر ہیں کہ اکثر صورتوں میں سرکار کا سرمایہ غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے۔ بڑی بڑی فوجیں اور جنگی جہاز رکھنے کی اصلی غرض یہ نہیں ہوتی کہ ملک میں امن و امان قائم ہو، جس سے قوم کا ہر فرد مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگا رہے۔ بلکہ اس ساز و سامان کی مراد

یہ ہوتی ہے کہ سلطنت کا دائرہ وسیع ہو' اور شاہی خاندان کو استحکام اور قوت حاصل ہو ۔ علاوہ بریں ادائیگی محصول کوئی تبادلہ دولت کی قسم سے نہیں ہے کہ اپنی خوشی سے سرکار کو ایک شے دی اور کوئی اور شے اس کے عوض میں حاصل کر لی ۔ بلکہ رعایا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ محصول کی کچھ نہ کچھ مقدار ادا کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دو فریق راستی پر ہیں۔ کیونکہ محصول سرکار کی بحث ایک اعتبار سے تقسیم اور دوسرے اعتبار سے صرف دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سڑکوں، پلوں اور دیگر عمارات کی تعمیر جدید، تجارتی بندرگاہوں کا افتتاح' محصول لگانے کے مختلف طریق اور اس کے جمع کرنے کے وسائل' اور نیز اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی خاص محصول زمین زمیندار کی ذاتی جیب سے نکلتا ہے یا حقیقت میں اس کے ادا کنندے پیداوار زمین کو استعمال میں لانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تمام اور اس قسم کے دیگر امور تقسیم دولت کی بحث میں آتے ہیں ۔ برخلاف اس کے سرکاری اخراجات کے نتائج کا نیک و بد ہونا صرف دولت کی بحث میں آتا ہے ۔

اگرچہ مال گذاری سرکار کی کئی صورتیں ہیں مگر اس باب میں ہم صرف دو بڑی صورتوں کا ذکر کریں گے جن پر غور کرنا ضروری ہے :-

(۱) محصولات زمین ۔

(۲) محصولات آمدنی ۔

قدیم الایام سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ فاتحین مفتوحوں کی پیداوار زمین میں سے کچھ حصہ وصول کریں' اور مختلف زمانوں میں اس حصہ' سرکار کی مقدار مختلف رہی ہے۔ مگر یہ امر عام طور پر مسلم ہے کہ سرکار واقعی زمین کی خصوصیات کے لحاظ سے اس پر ایک خاص محصول لگانے کا حق رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک خاص میعاد کے بعد جس کی مقدار آج کل دن بدن زیادہ سے زیادہ ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے' سرکاری طور پر زمینداروں سے

محصول کی ایک خاص مقدار ادا کرتے رہنے کا ایک معاہدہ کیا * جاتا ہے جس کو بندوبست کہتے ہیں - اور جس کی دو صورتیں ہیں -

(۱) زمینداری یا تعلق داری اضلاع جہاں زمیندار خود مالگذاری ادا کرتا ہے- خواہ زمین کی کاشت خود کرے خواہ اوروں سے کرائے -

(۲) اضلاع رعیت‌واری جہاں مزارعین اپنی اپنی مالگذاری خود ادا کریں - اور سرکار اور مزارع کے درمیان زمیندار کا واسطہ نہ ہو -

آج کل ہندوستان میں بعض اہل‌الرائے مسئلہ مالگذاری پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ بحث کر رہے ہیں - اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ افلاس و ادبار کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں سلسلہ بندوبست دوامی کو وسعت نہیں دی جاتی -

دت صاحب جنہوں نے حال میں سرکار ہند کے ساتھ اس اہم مضمون پر خط و کتابت کی ہے، فرماتے ہیں کہ بنگال میں بندوبست دوامی کے باعث دولت و اقبال نے ترقی کی ہے' اور عام لوگوں نے خاصہ سرمایہ جمع کر لیا ہے' جو مختلف قسم کی صنعتوں میں صرف ہو سکتا ہے- اس میں کچھ

---

* (حاشیہ از مصنف) پنجاب میں بالعموم حق ملکیت کی تین صورتیں ہیں -

(۱) زمینداری -

(۲) پتی داری - (۳) بھیا چارہ -

مقدم‌الذکر دو صورتوں میں تمام مالکان دہ مشترکہ طور پر مالگذاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں- اور تیسری صورت میں ہر حصہ دار اپنے حصہ زمین کی مالگذاری ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے- ان کے علاوہ مالکان خود کاشت بھی ہوتے ہیں' جو اپنی مالگذاری فرداً فرداً خود ادا کرتے ہیں -

شک نہیں ہے کہ مذکورہ بالا محقق کا ذاتی تجربہ اور ان کی مسلمہ لیاقت بہت بڑی وقعت رکھتی ہے۔ مگر ہماری رائے میں بنگال کی دولت و اقبال کا باعث صرف بندوبست دوامی ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے اور بھی اسباب ہیں جن کی طرف صاحب موصوف نے توجہ نہیں مبذول فرمائی۔ مشرقی بنگال خصوصیت سے زرخیز ہے اور ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ یہاں بارش بالکل نہ ہو، جیسا ہندوستان کے دیگر حصوں میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں صوبہ بنگال میں سن کی پیداوار ہوتی ہے جو ہندوستان میں کسی اور جگہ شاذ ہوتی ہے۔ مزید براں ملک ہندوستان کے اس حصے میں وسائل آمدورفت بھی بہ نسبت دیگر مقامات کے کامل ہیں۔ باوجود ان باتوں کے ایک سال بارش نہ ہوئی، تو بنگال میں ایک خوفناک قحط نمودار ہوا۔ بلکہ یہاں بندوبست کو دوامی کر دینے کا سوذی اثر یہ ہوا کہ زمیندار جتنا چاہتے تھے لگان لیتے تھے، اور اس طرح بیچارے کاشت کاروں پر بیجا ظلم و ستم ہوتا تھا۔ ان حالات میں سرکار ہند مجبور ہوئی کہ مزارعین کے حقوق کی حفاظت کرے، اور ان کو زمینداروں کے ظلم سے بچائے۔ پس اس غرض کے حصول کے لئے سرکار ہند نے کئی قانون و قواعد وضع کئے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک بنگال کی اقبال مندی زیادہ تر اس صوبے کی جغرافی خصوصیات کی وجہ سے ہے۔ اور کچھ ان قواعد کی وجہ سے ہے جو سرکار ہند نے مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لئے وقتاً فوقتاً وضع کئے ہیں۔ صوبہ بہار میں بندوبست دوامی کی وجہ سے لوگوں کو ۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی رعایت ہے۔ مگر باوجود اس بات کے گذشتہ تیس سال میں وہاں دو دفعہ قحط نمودار ہوا۔ اور لوگ اس قدر رعایت کے ہوتے ہوئے بھی قحط کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پس یہ کہنا کلیتہ صحیح نہیں ہے کہ رقم مالگذاری کا دوامی طور پر مقرر کر دیا جانا لوگوں میں قحط کا مقابلہ کر سکنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔

دوسری بڑی صورت مالگذاری سرکار کی ۔ صولات آمدنی ہے، یعنی وہ محصول جو آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔

اکثر حکماء نے محصولات آمدنی کے متعلق کئی اصول وضع کئے ھیں مگر چونکہ یہ عملاً کچھ بہت مفید نہیں ھیں' اسواسطے ھم ان کو نظر انداز کرتے ھیں ۔ یہاں صرف اس قدر ذکر کر دینا کافی ھوگا کہ انتظام مملکت کے استحکام کے لئے اس قسم کے محصولات کا ھونا ضروری ھے۔ ھاں محصول آمدنی میں اصولاً ایک یہ نقص ضرور ھے کہ آرام طلب اور سست لوگ جو کچھ نہیں کماتے اس کی ادائیگی سے بچ جاتے ھیں' اور اسکا سارا بار ملک کی آبادی کے اس حصے پر پڑتا ھے جو محنتی یا تجارت پیشہ ھوتا ھے۔

(ب) اکثر تجارتی ممالک میں بعض ایسے افراد ھوتے ھیں جنکی باریک بین نگاہ تجارت کی مدوجذر کو خوب پہچانتی ھے۔ یہ لوگ اصل معنوں میں نہ تاجر ھوتے ھیں نہ کارخانہ دار' نہ خردہ فروش ، نہ تھوک فروش۔ بلکہ بسا اوقات ان کے پاس اشیاء فروختنی کے بڑے بڑے ذخیرے بھی نہیں ھوتے ۔ صرف اپنی باریک بینی اور تجربے سے معلوم کر جاتے ھیں کہ فلاں شے کی قیمت اتنے عرصے میں کم یا زیادہ ھوجائیگی ۔ اور اسی رائے کے بل پر اشیاء کی خرید و فروخت سے بالعموم فائدہ اور بسا اوقات نقصان بھی اٹھا لیتے ھیں۔ مثلاً جب یہ دیکھتے ھیں کہ غلے کی قیمت کچھ عرصے میں بڑھ جانے کو ھے' تو جھٹ غلے کے سوداگروں کے ساتھ سودا کر لیتے ھیں' اور پھر گرانی کے موسم میں بسا اوقات عظیم الشان فائدہ اٹھاتے ھیں ۔ پیداوار محنت کی ایک بہت بڑی مقدار ھر سال ان لوگوں کے ھاتھوں میں سے گذرتی ھے اور اس وجہ سے قومی دولت کا کچھ حصہ ان تاجر نما افراد کے قبضے میں جاتا ھے۔ لہٰذا یہ ایک لحاظ سے گویا دولت کے چھٹے حصہ دار ھیں ۔ مگر یاد رکھنا چاھئے کہ اس قسم کے تاجروں کا وجود بالکل غیر مفید نہیں ھے۔ کیونکہ جو شخص اپنی باریک بینی اور تجربے کی وساطت سے مثلاً یہ معلوم کر لیتا ھے کہ فرضاً چار ماہ کے بعد غلے کی قیمت بہت بڑھ جائے گی' اور اس رائے کی صحت کے بل پر غلہ خریدنا شروع کر دیتا ھے' وہ ایک طرح سے اس امر کی طرف توجہ دلاتا ھے کہ غلے کی رسد زیادہ کرنے

کے لئے باھر سے زیادہ غلہ لانا چاھئے - اور نیز موجودہ ذخیرے کو زیادہ کفایت شعاری سے برتنا چاھئے - مختصر یہ ھے کہ اگر تجارت کی یہ صورت مناسب حدود کے اندر رھے ' تو اس کی وساطت سے اشیاء کی مانگ اور رسد کے درمیان مساوات پیدا ھوتی ھے ' اور قیمت اشیاء کے ناگھانی تغیرات کا اثر زیادہ محسوس نہیں ھوتا -

حصہ پنجم

★ آبادی

★ جدید ضرورتوں کا پیدا ہونا

★ صرف دولت

باب اول

آبادی

کسی شے کے صرف سے مراد اس شے کے استعمال سے ہے۔ صرف شے عدم محض کا مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً جب اینٹوں کی ایک خاص تعداد کا پل بن جاتا ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ اینٹوں کی تعداد صرف ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس صرف سے اینٹیں بالکل فنا نہیں ہو جاتیں۔ تاہم لفظ صرف کے مفہوم میں فنا کا مفہوم شامل ہے۔ اور صرف شے کے معنوں میں اس شے کا انعدام اور تبدیل ہئیت دونوں داخل ہیں۔

بعض حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دولت کی بحث مضامین اقتصاد میں داخل نہیں ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ مورخین کے لئے اس علم کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کے عمل سے مختلف اقوام عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے۔ اور اس جذرومد کے بواعث معلوم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اقوام عالم کی دولت اور اس کو صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کئے جائیں۔ علیٰ ہٰذاالقیاس ہم اپنی آئندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں، اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ کسی قوم کی آئندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے۔ بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی

موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے۔ اور اس کی عادات کس قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے دستکاروں کا ہنر اور ان کی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اس کے افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے' جس سے مفلسی اور بیماری اور دیگر بد نتائج پیدا ہوتے جائیں۔ باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب ہے کہ بعض حکماء اس بحث کو مضامین اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔

(۱) دولت کا پہلا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار کو سامان معیشت، لباس اور جائے رہائش ملتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گذارہ کرتا تھا۔ مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریق استعمال معلوم کرکے اپنی خوراک کو پکانا شروع کیا۔ علیٰ ہذاالقیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہے۔ اور بجائے ان کے لباس' جھونپڑیوں' چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔

(۲) دولت کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار رشتہ ازدواج استوار کرتا ہے[1]۔ بی بی کی خواہش ایک فطری خواہش ہے اور یہ بالعموم ان خواہشوں کے پورا ہو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے' جن کا پورا ہونا انسان کے جسمانی بقا کے واسطے انتہا درجے کا ضروری ہے۔ مگر بی بی انسان کے بعض قدرتی

---

[1] متن میں ''کی بی بی پرورش پاتی ہے'' تھا جو نامانوس تھا۔ اسے ''رشتہ ازدواج استوار کرتا ہے'' سے تبدیل کر دیا گیا ہے (مرتب)

تقاضوں کو ھی پورا نہیں کرتی، بلکہ ابتدائے تمدن میں خاوند کو اپنے کاروبار میں مدد دیتی ھے اور اس طرح اس کی پیداوار محنت پر بڑا اثر کرتی ھے ۔ اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیبیاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں ۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ھے جو اوپر مذکور ھوئی ۔ اور کچھ یہ کہ ھر قبیلہ اپنے افرادکی تعداد کو زیادہ کرنا چاھتا تھا، تا کہ اسے اس جنگ و جدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ھوتا ھے، دیگر قبائل پر غلبہ رھے ۔ تاھم یہ نہ سمجھ لینا چاھیئے کہ اقتصادی لحاظ سے تعددازواج تمدن کی ھر صورت میں مستحسن ھے ۔ کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ھے، جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ھوتی ھے ۔

(۳) صرف دولت کی تیسری صورت دستکار کے بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت ھے ۔ جس طرح بی بی کا ھونا دستکار کو محنت کی تحریک کرتا ھے، اسی طرح بچوں کا پیدا ھونا بھی اس کے لئے ایک مزید محرک ثابت ھوتا ھے ۔ بچے کی محبت ایک فطری تقاضا ھے ۔ پس باپ کا اپنے بچوں کو پرورش کرنا یا ان کی تعلیم و تربیت پر روپیہ خرچ کرنا کچھ اس خیال سے نہیں ھوتا کہ وہ بڑے ھو کر روپیہ کمائیں گے، یا قوم و ملک کی استحکام کا باعث ھوں گے، بلکہ اس کی محبت ایک طبعی جوش ھے جس کو کوئی شے دبا نہیں سکتی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض عورتیں بانجھ ھوتی ھیں اور بعض مرد قوت مردمی سے عاری ھوتے ھیں ۔ لیکن چوں کہ ان کی تعداد نہایت قلیل ھے اس واسطے اس واقعہ کو نظرانداز کر کے اس صریح اصول کو یاد رکھنا چاھئے کہ جس قدر کسی باپ کے بچوں کی تعداد زیادہ ھوگی اسی قدر اس کے وسائل آمدنی پر اثر پڑے گا ۔ اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ھو اور اس کی اولاد بڑھتی جائے، تو صاف ظاھر ھے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ

نہ رہے گی، جو پہلے اسے حاصل تھی - موجودہ آمدنی تمام افراد کے گذارے کے لئے کافی نہ ہو گی - اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آ جائے گا اور وہ پس انداز بھی جو کسی آڑے وقت کے لئے جمع رکھا ہو گا، خرچ ہو جائے گا - بلکہ قلت معیشت کی وجہ سے خاندان مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی جن کا اثر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا جائے گا - جب کسی قوم میں آبادی مناسب حدود سے زائد ہو جاتی ہے تو قدرت خود بخود وبا اور قحط کے تازیانوں سے اس کا علاج کرتی ہے - بچے اور بوڑھے اجل کا شکار ہو جاتے ہیں - جوانوں کی قوت مردمی میں فرق آ جاتا ہے - اور قحط بالعموم آبادی کی افزائش کو روکتا ہے - مگر محقق واکر کے نزدیک انسانی قبائل کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ وبا اور قحط کے وسائل کسی قوم کی آبادی کو مستقل طور پر کم نہیں کر سکتے - وسیع معنوں میں زندگی کا قیام ایک کلیہ قانون کی تابع ہے جس کو فلسفی قانون بقائے افراد قویہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں -

غالباً تمام حکمائے حال اس امر پر متفق ہیں کہ نظام عالم کا ہر حصہ اس قانون کے عمل سے متاثر ہوتا ہے - کیا نباتات کیا حیوانات اور کیا انسان، سب کی فنا و بقا کا اصلی راز اسی قانون کا عمل ہے - تم جانتے ہو قیام حیات کے وسائل و اسباب ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں - پس جب یہ اسباب و وسائل دفعتاً متغیر ہو جائیں اور جانداروں کے کسی خاص طبقے میں وسائل بقا کے تغیر کے ساتھ ہی ان کے مطابق تبدیلی پیدا کر سکنے کی صلاحیت نہ ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ طبقہ فنا ہو جائے گا - اور وہی حیوان محفوظ رہیں گے جو ان وسائل متغیر شدہ میں قائم رہنے کی قابلیت رکھتے ہوں گے - مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کی آب و ہوا میں دفعتاً اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو چار پایوں[2] کے حق میں نہایت مضر ہے - اس حالت میں صرف وہی چارپائے زندہ رہ سکیں گے - جن کے قویٰ میں تبدیل شدہ آب و ہوا کے متحمل ہو سکنے کی قابلیت ہو گی - باقی سب فنا ہو جائیں گے - غرض کہ نظام عالم کے ہر حصے میں جانداروں کے درمیان ایک قسم کی مصاف ہستی

---

[2] یہاں اصل نسخے میں ''پاؤں'' لکھا تھا - (مرتب)

شروع ہے جس میں قوی افراد فتح پاتے ہیں اور ضعیف و ناتواں افراد صفحہ عالم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں ۔ مگر محقق واکر کہتا ہے کہ انسان کی بقا و فنا کی صورت میں یہ قانون کامل طور پر عمل نہیں کر سکتا اور وبا و قحط سے جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں ، انسانوں کی تعداد میں کوئی مستقل کمی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ ان کے نزدیک انسان اور دیگر حیوانوں میں ایک بڑا فرق ہے ، جو انسان کو اس قانون کے عمل سے آزاد کرتا ہے ۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہتا ۔ مگر انسان کی حالت اس سے مختلف ہے ۔ نسبی تعلق جو تمدن انسانی میں خاندان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک ایسا زبردست رشتہ ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد سے جدا نہیں ہونے دیتا ۔ جانداروں کے کسی طبقے کا کوئی فرد اگر کسی دکھ درد میں مبتلا ہو جائے ، تو باقی افراد کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ۔ مگر انسانی خاندان کے کسی فرد کو اگر کوئی مرض لاحق[3] ہو جائے تو باقی افراد نہایت خلوص اور محبت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو موت کے پنجے سے چھوڑانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ لہٰذا وہ مصاف زندگی جو اور حیوانات میں بوجہ اجنبیت وغیریت جاری ہے انسانی قبائل میں بوجہ یگانگت اور تعلقات نسبیہ کے معدوم ہے ۔ اس استدلال سے ، محقق موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسانی زندگی بوجہ اس یگانگت کے جو تعلقات نسبیہ سے پیدا ہوتی ہے مذکورہ بالا قانون کے عمل سے کلی طور پر آزاد ہے ۔ مگر ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نسبی تعلقات کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کے کمزور اور ناتوان افراد کی حفاظت کرتا ہے ، اور مختلف افراد انسانی کے درمیان وہ اجنبیت اور غیریت نہیں ہے جو حیوانوں کو قانون افرادقویہ کے تحت میں لاتی ہے ۔ تاہم یہ اجنبیت اور غیریت مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے ۔ اگرچہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں ہے ۔ حکیم موصوف کا خیال اس صورت میں صحیح ہوسکتا ہے جب تمام انسان یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں ۔ اور نہ صرف یہ محسوس

---

۳ ۔ یہاں لفظ ''لاحق'' کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ (مرتب)

ھی کریں بلکہ عملی طور پر اسکو کرکے بھی دکھا دیں - ھم اس بات کو تسلیم کرتے ھیں کہ تمدنی انسانی کے سب سے اعلیٰ صورت یہی ھے کہ تمام بنی نوع انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں - مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں' اس واسطے وہ اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں میں موجود ھے' اور جو ان کو مذکورہ بالا قانون سے متاثر کرتی ھے' مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ھے - فرق صرف اس قدر ھے کہ حیوانات میں مصاف زندگی افراد کے درمیان جاری ھے' مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ھے-ھر خاندان اور ھر قوم اس مصاف ھستی میں فتح مند ھونے کی خواھش کرتی ھے - اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ھے کہ حریف کو گرا کر تمام روے زمین کے خود وارث بن جائیں - جس طرح اس قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قدیم قسمیں صفحۂ ھستی سے معدوم ھوگئیں ھیں - اسی طرح اس قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرف غلط کی طرح کتاب ھستی سے مٹ گئی ھیں' اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رھا - بلکہ ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ غیر مادی اشیاء مثلاً خیالات و مذاھب کا قیام بھی اسی قانون کے تابع ھے - جو خیال یا مذھب انسان کے تمدنی حالات اور اس کی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کر سکے گا - ضرور ھے کہ وہ انسان کی جدید روحانی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث معدوم ھو جائے - پس ھماری رائے میں مذکورہ بالا قانون انسانی قبائل کی صورت میں بھی اپنا عمل بدستور کر رھا ھے - اور قحط و وباء اور آبادی کو کم کرنے کے دیگر قدرتی وسائل کو جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ھیں' اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ھوتا ھے کہ یہ چیزیں تمدن انسانی کی ترقی کے لئے نہایت ضروری شرائط ھیں -

یہاں تک تو ھم نے یہ ثابت کیا ھے کہ آبادی کا مناسب حدود سے باھر نکل جانا افلاس اور دیگر بد نتائج کا سر چشمہ ھے - مگر عملی نتائج پر پہنچنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ھے کہ انسانی موت و پیدائش کے درمیان صحیح نسبت کیا ھے - یہ ایک ظاھر واقعہ ھے کہ بعض پیدا

ہوتے ہیں بعض مرتے ہیں۔ لیکن مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معمولی اموات وغیرہ کو نکال کر شرح پیدائش فی زن و مرد کیا ہے۔ حکیم مالتھس اپنے مضمون موسوم بہ ''آبادی'' میں یہ اصول دریافت کرتا ہے کہ باوجود تجرید اور ضعف مردمی کے جو بعض صورتوں میں ہوتا ہے' انسان کی شرح پیدائش بحساب اوسط بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہے۔ اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آئندہ نسلوں کی قوت تولد و تناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا' تو صاف ظاہر ہے کہ نوع انسان کی آبادی کا شجر مندرجہ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہوکر بارآور ہوتا جائیگا:—

۲ | مرد عورت کا ایک جوڑا جو حکیم مالتھس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط ۲ لڑکیاں اور ۲ لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑے سے دو جوڑے پیدا ہوتے ہیں۔

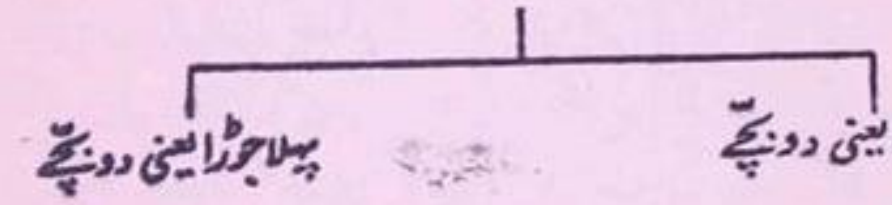

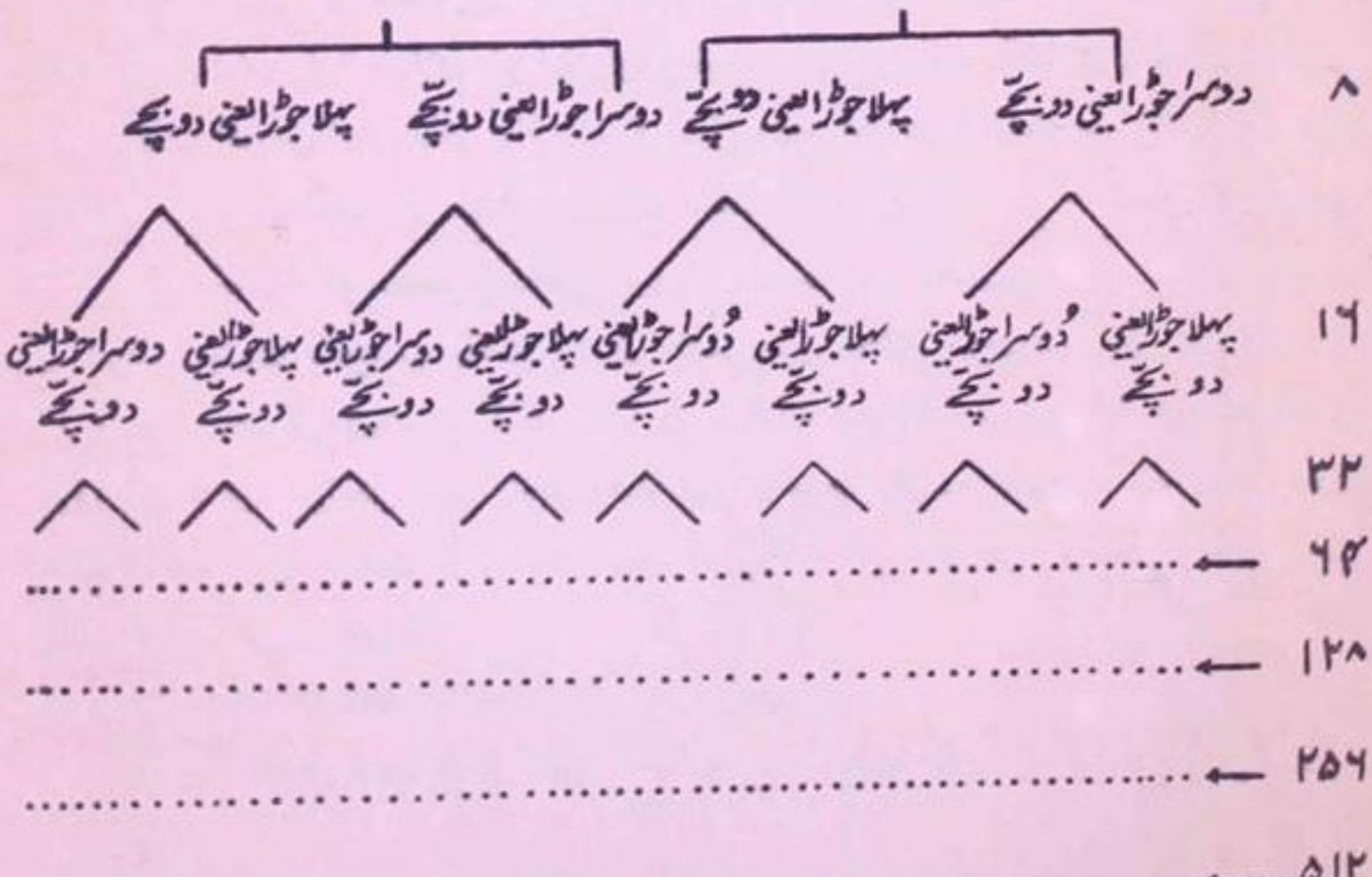

اس سلسلے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دگنا ہے۔ پس یہ وہ سلسلہ ہے جو اصلاح ریاضی میں سلسلہ ہندسیہ[4] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلہ ہندسیہ کے مطابق برابر بڑھے گی۔ مگر بر خلاف اس کے تم پیچھے پڑھ آئے ہو کہ پیداوار زمین یعنی خوراک انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لہٰذا اس واقع سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوع انسان کی آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل اس کے لئے کفایت نہیں کر سکتے۔ ذرا خیال تو کرو اگر نوع انسان کی آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقل خداداد کی وساطت سے اپنے وسائل زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے، تو بنی آدم کا کیا حشر ہو گا۔ فطرتاً انسان اس قسم کی ہستی ہے کہ اس کے قویٰ نظام قدرت کے ان قویٰ کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو اس کے قیام زندگی کے مخالف ہوں۔ قدرت عظیم الشان جنگوں، وباؤں اور قحطوں کی وساطت سے خود بخود آبادی انسان و حیوان کو کم کرتی ہے اور انسان اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قویٰ پر غلبہ پا سکتا ہے۔ یا افزائش آبادی کے[5] میلان کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا اندازسے زیادہ بڑھ جانا ہے*۔ اکثر ممالک کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ نوح انسان کی آبادی

---

* (حاشیہ از مصنف) محقق سپنسر نے حکیم مالتھس کے اصول آبادی پر ایک نہایت دلچسپ بحث کی ہے، جس میں محقق موصوف نے علم الابدان کے رو سے اس کی کلیت سے انکار کیا ہے۔ البتہ اس قدر تسلیم کیا ہے کہ تمدنی ترقی کے خاص مراحل میں اصول مذکور صحیح ہے۔ کیوں کہ یہ بحث علم الاقتصاد کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس واسطے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

[4] Geometric progression (مرتب)

[5] یہاں اصل میں کلمہ ''کی'' تھا جسے درست کر دیا گیا ہے (مرتب)

پچیس سال میں دگنی ہو جانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو۔ وہاں کے لوگوں کو چاہئے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔ انسان کی قوت تولد و تناسل قدرتاً کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ جائے تو اس کا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہو گا۔ اجرت کی بحث میں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب دستکار افزائش آبادی کے بد نتائج کو محسوس کریں گے تو خود بخود ایسے وسائل اختیار کریں گے جن سے آبادی کم ہو۔ مگر تجربہ اس بات کے خلاف ہے۔ چین اور ہندوستان کی موجودہ حالت یہ ظاہر کرتی ہے۔ غریبی اور افلاس کی صورت میں انسان کی قوت تناسل و توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے جس سے آبادی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی اور مفلسی کے درد کی شدت کو اور زیادہ جان فرسا بناتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افزائش آبادی کا قدرتی علاج یعنی قحط ان ممالک کو آئے دن ستاتا رہتا ہے۔

باب دوئم

جدید ضروریات کا پیدا ہونا

نوع انسان کی آبادی کے متعلق مندرجہ بالا خیالات اول اول حکیم مالتھس نے ظاہر کئے تھے - حکیم موصوف نے تجربے، مشاہدے اور تاریخی شہادت سے اس امر کو ثابت کیا کہ

(۱) ہر ملک میں آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لئے کفایت نہیں کر سکتی -

(۲) بہت کم قومیں اس افزائش آبادی کو روکنے کے قابل ہوئی ہیں -

(۳) اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لئے کفایت نہ کرے تو انسان کی قوت توالد و تناسل بجائے اس کے کہ اس کا عمل کم ہو، مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے، اور آبادی کی مقدار کو اور زیادہ کرتی ہے -

(۴) اگر فراغت سے زندگی گذارنے کا خیال افزائش آبادی کو روکنے سے قاصر ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ مفلسی اور احتیاج کا خوف بلکہ حقیقی طور پر افلاس کی بیماری میں مبتلا ہو جانا بھی اس کو روک سکے -

(۵) دنیا کی کوئی قوم ان مصائب کے اندیشے سے آزاد نہیں ہے جو افزائش آبادی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان ضروری قضایا کو ثابت کرنے کے بعد حکیم مالتھس ان موانع کا ذکر کرتا ہے جو افزائش آبادی کو روکتے ہیں۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا دکھ درد کا ایک ایسا خوفناک نظارہ ہوتی کہ کسی درد مند دل کو اس کے دیکھنے کی تاب بھی نہ ہوتی۔ بلکہ ان اسباب کے ہوتے بھی کثیر التعداد بنی آدم غریبی کے روز افزوں دکھ میں مبتلا ہیں۔ جس کی شدت سے مجبور ہو کر ان کو ایسے ایسے جرائم کا مرتکب ہونا پڑتا ہے، جو انسان کے لئے ذلت و شرم کا باعث ہیں، اور اس کی صحیح فطرت کے صاف اور روشن آئینہ کو تیرہ و تار کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے، تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی۔ اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں یک قلم معدوم ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ حالات کے رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسان کی آبادی کم ہو، تا کہ موجودہ سامان معیشت کفایت کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر نئے نئے جزائر دریافت ہوتے جائیں جہاں انسان جا کر آباد ہو سکے اور قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ کامل طور سے کیا جا سکے، تو آبادی کی افزائش آسائش انسانی میں خلل انداز نہ ہو سکے گی۔ مگر چونکہ زمین کمیت میں محدود ہے، اور اس کی پیداوار کچھ نہ کچھ قانون مذکور کے تابع ہے، اس واسطے ضرور ہے کہ افزائش آبادی کے خوفناک نتائج ہمارے آرام و آسائش کے مخل ہوں اور ہمیں اس فراغت سے محروم کر دیں جو بصورت کمی آبادی ہم کو حاصل ہوتی۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لاویں۔ جو ہمارے اختیار میں ہیں کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر آبادی انسان کو

کم کرے - اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرے - حکیم مالتھس کے نزدیک آبادی انسان کی ترقی کو روکنے کے وسائل دو قسم کے ہیں -

(۱) قدرتی یا غیر اختیاری وسائل- مثلاً وبا، قحط اور جنگ، وغیرہ

(۲) اختیاری- مثلاً افراد انسانی کا شادی سے باز رہنا اور اپنے تقاضائے نفسانی اور جذبات فطری کو قابو میں رکھنا اور دیر کے بعد شادی کرنا - اگر ان وسائل کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ افزائش آبادی پر ان کا پورا اثر ہو، تو قدرتی وسائل یعنی قحطوں اور وباؤں کا تو اثر خود بخود کم ہو جائے گا - کیونکہ قحط خوراک کھانے والوں کی کثرت سے پیدا ہوتا ہے- اور وبا مفلسوں کی کمی خوراک اور ان کی جائے رہائشی و لباس وغیرہ کے غیر مصفا ہونے سے پیدا ہوتی ہے -

تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں - مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے- جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کی آراستگی اور ان کے نقش و نگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے- چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے، لہٰذا انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے - یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوت توالد و تناسل کو بھی کفایت شعاری سے برتنے لگتا ہے - موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بیٹوں کی شادیاں نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہو لیں - بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں - بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرک یہی امر ہوتا ہے

کہ بیٹے کی شادی ہو گئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائیگی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم کو خیر باد کہنی پڑیگی - صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرض التوا میں ڈالنا گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے- جو بصورت دیگر ایام کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی - علاوہ بریں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کے خور و نوش اور طرح طرح کے اسباب تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے' جو اسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے' اور اس کی قوت تناسل و توالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کر سکتا - کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارہ کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے- اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے- علیٰ ہذاالقیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خود کاشت میں منقسم ہے' زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں - کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہوگی - اسی قدر ان کی جائداد زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی - اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونی شروع ہو گئی تو حصۂ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گذارے کے لئے کسی طرح کافی نہ ہوگی - مگر یاد رکھنا چاہئے کہ افزائش آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جبکہ زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی ہو - یا بالفاظ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ سامان معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہو سکے گی - ان اصول کے رو سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے - ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے - اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے- قدرت قحط اور وباء سے اسکا علاج کرتی ہے- مگر ہمکو بھی چاہئے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں - اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دور اندیشی سے صرف کریں - صنعت و حرفت کی طرف توجہ کر کے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم

کے انجام کی فکر کریں، تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہو کر تہذیب و تمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے، جنکے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے۔ ان سطورسے تم نے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدرہے کہ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا ہو۔ اور بی بی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو۔ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

---

1 - یہاں اصل میں ''مقدار'' تھا (مرتب)

باب سوم

صرف دولت

مضمون گذشتہ کی تصریح کی رو سے جدید ضروریات جو پیدا ہوتی ہیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کے پورا کرنے کی طرف نسبتاً کم توجہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے سیل رواں کو مسدود کرنے کے لئے کسی زیادہ زبردست روک کا ہونا ضروری ہے۔ تاہم موجودہ حالت میں جدید ضروریات کا پیدا ہوتے جانا کسی اور روک کے نہ ہونے سے اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی محققین کے نزدیک جہاں تک ممکن ہو۔ سامان معیشت ارزاں نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ حکیم مالتھس کے مسائل کی رو سے اشیاء خوردنی کی ارزانی افزائش آبادی کے خوفناک نتائج کی طرف سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور یہ بے فکری اس کی آیندہ بہبودی کی دشمن ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء ارزاں ہوں، تو صاف ظاہر ہے کہ ایک سال فصل کے نہ ہونے سے ان کی جان پر آبنے گی۔ کیوں کہ ان کا گذارہ پہلے ہی سے ایسی اشیاء پر تھا جو تمام دیگر اشیاء کی نسبت ارزاں تھیں۔ اور اب اس آڑے وقت کے لئے کوئی ارزاں تر شے نہ ہوگی، جس پر وہ اپنا گذارہ کر سکیں۔ لیکن اگر ان کے استعمال کی چیزیں ذرا گراں قیمت ہوں، تو قحط سالی میں وہ ارزاں اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں۔ کشمیر میں چاول سب سے ارزاں شے ہوتی ہے، اور لوگ بالعموم اسی شے پر گذارہ کرتے ہیں۔ لیکن

جس سال چاول نہیں ہوتے ان کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس آڑے وقت میں ان کو کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہوسکتی جو چاولوں سے زیادہ ارزاں ہو' اور جس پر وہ اپنا گذارہ کریں - جو سب سے ارزاں شے تھی وہ پہلے ہی ان کے استعمال میں تھی - اب اس سے زیادہ ارزاں شے کہاں سے آئے۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی اشیاء خوردنی ارزاں ترین اشیاء نہ ہوں بلکہ کسی قدر گراں قیمت اشیاء ہوں تاکہ اگر ان گراں قیمت اشیاء کا قحط پڑ جائے تو ان ایام میں وہ سستی اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں - حکیم مالتھس کے مسائل کا یہ نتیجہ صحیح ہے۔ لیکن اگر عوام اپنا نفع نقصان سمجھ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم رکھنے کی کوشش کریں تو صاف ظاہر ہے کہ سامان معیشت اور اشیاء خوردنی کی ارزانی بجائے اس کے کہ برے نتائج پیدا کرے' ان کے حق میں ایک نعمت ہوگی - کیوں کہ جو روپیہ کھانے پینے سے بوجہ ارزانی کے بچ رہے گا' وہ دیگر آرام و آسائش کے سامانوں پر صرف ہو سکے گا - یا بطور سرمایہ کام آسکے گا - صرف دولت کی مختلف صورتوں کا معلوم کرنا خصوصاً اس حالت میں جبکہ لوگ اپنا نفع نقصان سوچ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم کرنے کی کوشش کریں' انتہا درجے کا ضروری ہے - کیوں کہ صرف دولت کی مختلف صورتیں گویا مختلف اسباب ہیں جو دولت کی آیندہ پیدائش پر اثر کرتے ہیں - موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کی سیاسی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزا ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں - علیٰ ہٰذالقیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں' اور پیدائش دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں - انگلستان میں اس وقت دو ارب ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف شراب پر خرچ ہوتا ہے اگر یہی

روپیہ کسی اور مفید صورت میں صرف ہوتا تو ملک کی اقتصادی حالت پر نہایت اچھا اثر کرتا۔ موجودہ زمانے میں ایک ایسے فلسفی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، جو مندرجہ بالا امور کی پوری تفتیش اور تحقیق کر کے علم الاقتصاد کے اس حصہ کو پورا کرے۔

ضمیمہ

ان معاشی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں

A

Agent	عامل - کارندہ
Alternative Standard	متبادل معیار
Arbitration	ثالثی، پنچایت
Assets	اثاثہ

B

Balance of Trade	توازن تجارت
Bank	بنک
Banking	بنکاری

Barter	جنسی تبادلہ
Bill of Exchange	ہنڈی
Broker	دلال
Brokerage	دلالی
Bullion	فلز
Business Organisation	کاروباری تنظیم

C

Capital	اصل سرمایہ
Capital Expenditure	مصارف اصل ، مصارف سرمایہ
Capitalism	اصل دارانہ نظام
Circulating Capital	سرمایہ دائر
Circulating Medium	گشتی زر ، چالو زر
Clearing House	تبادلہ گاہ
Coin	سکہ
Coinage	سکہ زنی
Communism	اشتمالیت (اشتراکیت)
Competition	تجارتی رقابت ، مقابلہ
Concentration	ارتکاز
Consumer	صارف
Consumption	دولت کا صرف یا استعمال

Convertible	بدل پذیر
Convertible Paper Money	زر کاغذی متبدل
Cooperative Principle	اصول امداد باهمی
Cost	لاگت
Cost of Coinage	حق‌الضرب
Cost of Production	مصارف پیدائش
Cost of Transport	مصارف باربرداری
Cost Price	لاگتی قیمت
Cottage Industries	گھریلو صنعت
Credit	ساکھ ، اعتبار ، قرض
Credit Instrument	دستاویز اعتبار
Current Price	قیمت متعارف

D

Debt	قرضہ
Distribution	دولت کی تقسیم
Debt, Public	سرکاری قرضہ
Demand	طلب
Demand Price	قیمت طلب
Differential Comparative Cost	اختلاف مصارف متقابلہ
Discount	مٹی کاٹا
Disequilibrium	عدم توازن
Divisibility	تقسیم پذیری

Division of Labour	انقسام محنت
Duty	محصول

E

Economic Rent	معاشی لگان
Efficiency	کارکردگی
Elasticity	لوچ ، لچک
Elasticity of Demand	طلب کا لوچ (لچک پذیری طلب)
Elasticity of Supply	رسد کا لوچ (لچک پذیری رسد)
Employer	آجر
Equilibrium Price	قیمت صحیحہ
Exchange	دولت کا تبادلہ
Exchange Goods	اشیاء قابل تبادلہ
Exploitation	استحصال
Export Import Duty	محصول درآمد و بر آمد

F

Face Value	عرفی قیمت
Factors of Production	عاملین پیداوار
Fertility	زرخیزی
Finance	مالیات

Fiscal	محصولی
Fixed Capital	سرمایه قائم
Foreign Exchange	تبادلهٔ خارجه
Foreign Trade	خارجی تجارت
Free Coinage	آزاد سکه سازی
Free Competition	آزاد مسابقت
Free Goods	اشیاٴ آزاد
Free Trade	آزاد تجارت
Fund	ذخیره ، صندوق

G

Geometric Progression	سلسلهٔ هندسیه
Gold Standard	معیار طلاء
Gross Interest	سود کاذب
Gross Profit	خام منافع
Gross Revenue	خام آمدنی

I

Imperfect Competition	مقابله ناکامل
Import	درآمد
Income Tax	محصول آمدنی
Inconvertible Paper Money	زر کاغذی غیر متبدل
Industrialism	صنعتیت
Inflation	افراط زر

Interest	سود
International Trade	بین الاقوامی تجارت
Intrinsic Value	قیمت ضربی
Issue	اجراء

L

Labour	محنت
Labourer	محنتی
Land Revenue	مالگزاری
Law of Diminishing Utility	قانون تقلیل افادہ
Law of Diminishing Returns	قانون تقلیل اصل
Legal Tender	نقد قانونی
Liability	ذمہ داری ، دین داری
Luxuries	تعیشات

M

Margin	حد
Margin of Cultivation	کنارہ زراعت
Marginal	حدی ، مختتم
Marginal Utility	افادت انتہائی
Market	بازار

Measure of Value	پیمانۂ قدر
Mercantilism	نظام تجارت
Metallic Value	دھاتی قدر ۔ فلزاتی قدر
Mineral Resources	معدنی ذرائع ، معدنی وسائل
Mobility	نقل پذیری
Money	زر
Monopoly	اجارہ
Mortgage	رھن
Mortgager	مرتھن
Mortgagee	راھن

N

Nationalization	قومی ملکیت بنانا ، قومیانا
National Wealth	قومی دولت
Necessaries	ضروریات
Net Interest	خالص سود
Net Revenue	خالص آمدنی
Nominal Value	ظاھری قدر
Nominal Wages	ظاھری آجرت

O

Optimum Point	نقطۂ تقلیل
Output	مقدار (کام یا پیداوار کی)

Over-Population	کثرت آبادی

P

Paper Money	زر کاغذی
Parity of Exchange	شرح مبدل
Peasant Proprietor	مالک کاشتکار ، خود کاشت زمیندار ، فلاح
Personal Wealth	ذاتی دولت
Planning, Economic	معاشی منصوبہ بندی
Positive Checks	اثباتی روک
Preventive Checks	انسدادی روک
Price	قیمت
Productive	دولت آفریں
Productivity	قابلیت پیداوار
Production	دولت کی پیدائش
Profit	منافع
Property	جائداد
Protection (of trade) or Protective Trade	حفاظت تجارت یا تامین تجارت
Public Debt	سرکاری قرضہ
Public Finance	مالیات
Public Revenue	محصول آمدنی
Raw Material	مصالح

R

Real Wages	حقیقی اُجرت
Rent	لگان

Retail	خردہ فروشی
Revenue	آمدنی ، محاصل

S

Saving	بچت
Scarcity	دقت حصول
Skill	مہارت
Specialisation	تخصیص
Standard of Deferred Payment	ادائیگی غیر مؤجل کا معیار
Standard of Value	معیار قدر
Stocks	ذخیرے
Supply	رسد
Surplus	فاضل

T

Tax	محصول
Taxation	محصول بندی
Technology	علم صنعت
Token Money	زر علامتی
Trade Cycle	تجارتی چکر

U

Usury	ربا
Utilities	مفیدات

Utility	افادت
Utility, Form	قدر مختص بالهیئه
Utility, Place	قدر مختص بالمکان
Utility, Time	قدر مختص بالزمان

V

Value	قدر
Velocity of Circulation	سرعت انتقال

W

Wage	آجرت
Want	احتیاج
Wealth	دولت
Working Capital	کاروباری سرمایه

مطبوعہ فروزسنز لمیٹڈ ، لاہور